ہندوستان ایک نہایت وسیع و عریض ملک ہے، اس میں مختلف قومیں اور ملتیں آباد ہیں اور اس کے مختلف علاقوں میں نسلی، مذہبی، لسانی اور جغرافیائی حیثیت سے بڑا فرق و اختلاف بھی ہے، اسلئے اس ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مختلف قوموں میں اتحاد و یکجہتی کا مسئلہ بڑا اہم ہے، مصنف نے اسکی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد قوم، قومیت اور یکجہتی کا مفہوم بیان کیا ہے اور ان کے متعلق اسلامی تصور اور نقطۂ نظر پیش کیا ہے، انھوں نے مختلف طبقہ و نسل کے لوگوں میں یکجہتی و اتحاد کو فروغ دینے کے متعلق اسلام کی تعلیمات اور کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری اور کسی ملک میں محکوم مسلمانوں کے فرائض بھی بتائے ہیں، مصنف نے اتحاد و یکجہتی کے اس مفہوم کی تردید کی ہے، جس کے نتیجہ میں اس ملک میں آباد تمام لوگوں کو ایک ہی مذہب اختیار کرنے اور ایک ہی زبان کو اپنا لینے یا بالفاظ دیگر قومی دھارے میں شامل ہونے کی دعوت دی جاتی ہے، ان کے خیال میں ہر آدمی اپنی قومی، ملی اور مذہبی خصوصیات پر قائم رہنے کے باوجود ملک کا وفادار ہو سکتا ہے اور قومی یکجہتی کا نمونہ پیش کر سکتا ہے، اس ضمن میں ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

ہمارے اسلاف:- مرتبہ مولوی عبد العلی فاروقی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۵۲، قیمت آٹھ روپیے، پتہ مکتبۃ البدر، دار العلوم فاروقیہ، کاکوری، لکھنؤ۔

اس مختصر کتاب میں تیس صحابہ کرامؓ کے مختصر حالات و سوانح درج ہیں، شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ کا ذکر جمیل بھی ہے، اس کے بعد پہلے عشرہ مبشرہ اور آخر میں دوسرے جلیل القدر صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، مصنف کو اعتراف ہے کہ اس موضوع پر ضخیم کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں، جن کے مطالعہ کے لئے کافی وقت درکار ہے، اس لئے انھوں نے ان مشہور صحابہ کی سیرت کو مختصر طور پر بیان کیا ہے، جن کا ذکر ہر موقع پر آتا ہے، اور چونکہ یہ کتاب کم پڑھے لکھے لوگوں اور طالب علموں کیلئے لکھی گئی ہے اسلئے اسکی زبان سہل اور آسان ہے، صحابہ کرام کی سیرت مقدسہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا جزو اور پر تو ہے، اس لئے ان کا تذکرہ لکھنا ایک بڑی سعادت ہے، یہ کتاب سیرت کی کتابوں خلفائے راشدین اور مہاجرین وغیرہ کی مدد سے لکھی گئی ہے، جن کے کہیں کہیں حواشی میں صفحات کی تعیین اور مصنفین کے ناموں کی صراحت کے بغیر حوالے بھی دیئے ہیں، مگر دیباچہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، اگر صحابہ کرام کے اخلاق و سیرت کے دلکش نمونے اور موثر واقعات زندگی پیش کرنے کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہوتا تو کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے زیادہ مفید اور کامیاب ہوتی۔

"ض"

جلد ۱۳۵ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۵ء عدد ۴

مضامین

سلسلہ اسلام اور مستشرقین

جلد اول

دار المصنفین میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس کی پہلی جلد مرتب ہو کر چھپ گئی ہے، یہ فروری ۸۲ء میں اس موضوع پر جو سیمینار ہوا تھا، اس کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد ہے۔

"منیجر"

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو اور بہار اردو اکاڈمی کے بعد استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلہ میں کل ہند انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام دہلی میں ایک باوقار سمینار ۹ر-۱۰ر مارچ کو ہوا،

انجمن کے موجودہ سرگرم اور متحرک جنرل سکریٹری جناب ڈاکٹر خلیق انجم کی وجہ سے اس کے ذریعہ سے اہم علمی، ادبی اور لسانی خدمات انجام پارہی ہیں، انھوں نے جو اہم ترین کام انجام دیا ہے، وہ انجمن کے لیے راؤز ایونیو میں شاندار اردو گھر کی تعمیر ہے، اس کے لیے وہ ہر طرح کی دلی مبارکباد کے مستحق ہیں، شاہ جہاں کو دہلی کے لال قلعہ کی تعمیر میں شاید اتنی مشکلوں اور پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوگا جتنا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کو اردو گھر بنانے میں پڑا ہوگا، اب یہ عمارت دہلی کے قلب میں کھڑی ہوکر زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ دہلی کے قلعۂ معلی کی زبان ایک بار پھر اردوئے معلی بن کر رہے گی، اسی اردو گھر میں حضرت سید صاحبؒ پر سمینار ہوا، اس میں معززین کا جو اجتماع ہوا وہ اسے کامیاب بنانے کا ضامن تھا۔

سمینار کا افتتاح عالی جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ نے اپنے پرمغز اور دلنشین خطبہ سے کیا، اس کو سن کر خاکسار راقم کی طرح اور حاضرین کو خوشی ہوئی کہ ایک بے حد مشغول اعلیٰ عہدیدار کی نظر، علم و فن کے ایک بحر العلوم اور قلم کے قلمرو کے ایک حکمراں پر اتنی اچھی ہے، معارف کے ناظرین کو بھی اس کا اندازہ اس کو پڑھ کر ہوگا، جو معارف کی اسی اشاعت میں شایع کیا جارہا ہے۔

اس سمینار میں جو مقالات پڑھے گئے ان کی نوعیت کا اندازہ ان کے حسب ذیل عنوانات سے ہوگا: مولانا سید سلیمان ندویؒ ایک ادیب کی حیثیت سے، از پروفیسر عبد المغنی (پٹنہ) مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ایک اہم خط پر اظہار خیال، از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی یونیورسٹی) مولانا سید سلیمان ندویؒ کا تصور نبوت و شریعت، از ڈاکٹر عنوان چشتی (جامعہ ملیہ دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ کو چۂ شاعری میں، از ڈاکٹر نعت سروش (غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور فارسی ادبیات، از ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی یونیورسٹی) دبستانِ شبلی کے ایک ممتاز ادیب، از ڈاکٹر مسز افتخار بیگم صدیقی (ذاکر حسین کالج دہلی) سید صاحبؒ کا نظریۂ علم از ڈاکٹر مشیر الحق ندوی (جامعہ ملیہ دہلی) مکاتیب سلیمان ایک جائزہ، از جناب عبد اللطیف اعظمی، (جامعہ ملیہ دہلی) آزادی سے پہلے ہندوستان میں فرقہ پرستی اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا نقطۂ نظر، از انور عالم (دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور اردو ادب، از ارتضیٰ کریم (دہلی) مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ندوۃ العلماء، از سید شہاب الدین دسنوی (پٹنہ) مولانا سید سلیمان ندویؒ حالات اور کارنامے، از ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی) سیرۃ النبیؐ میں اردو کے مستعمل الفاظ کی تحقیقات، از مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی (دار المصنفین اعظم گڈھ) حضرت سید صاحبؒ اور دار المصنفین، از مولوی ابو البقار ندوی (دار المصنفین اعظم گڈھ) حضرت سید صاحبؒ کی خیام پر ایک نظر، از خاکسار راقم۔

حضرت سید صاحبؒ کی علمی فضیلت اور جلالت کچھ ایسی ہے کہ زیادہ تر مقالہ نگاروں نے اس کا اعتراف کیا ہے، کچھ اعتراضات بھی ہوئے، مثلاً ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنے مقالہ میں یہ پیش کیا کہ سید صاحبؒ نے نبی کو محض بشر کہا ہے، مثل بشر نہیں کہا ہے، اور مثل کی تشریح سے گریز کیا ہے، یہ تمام مباحث سید صاحبؒ کی سیرۃ النبی جلد چہارم میں ہیں، جن کو غور سے پڑھا جائے تو اس میں سید صاحبؒ نبی کو نہ صرف بشر بلکہ مافوق البشر بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ ان کی مافوق بشری خصوصیات، اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی ہیں، ان کا سرچشمہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت اور ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے (سیرۃ النبی جلد چہارم، ص ۱۱۴، ۱۲۱، ۱۳۷) یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سید صاحبؒ نے مثل کی تشریح سے گریز کیا ہے، سیرۃ النبی جلد چہارم میں مثل بشر کی تشریح کم از کم دس مختلف جگہوں پر کی گئی ہے، کلام پاک میں نبی کے لیے مثل بشر کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے، بلکہ بشر ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، البتہ نبوت کی وجہ سے وہ مافوق بشری خصوصیات کے حامل ہوجاتے ہیں۔

آخر میں پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اجتہادی غلطی کرنے والے جزوقتی نبی کا تصور پیش کیا ہے وہ قرآن کے اس تصور نبوت کے خلاف ہے جس میں نبی خطا اور نسیان سے محفوظ رہتا ہے، یہ اعتراض بھی صحیح نہیں، سید صاحبؒ جزوقتی نبی کے تصور کی تردید کرتے ہیں اور اس کو تفریط پسند گروہ کی ایجاد قرار دیتے ہیں اور اس پر انھوں نے افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس کو اعتدال کی حد سے باہر قرار دیا ہے (سیرۃ النبی جلد چہارم ص ۱۱۶)، رہی یہ بات کہ رسول اور نبی خطا اور نسیان سے محفوظ ہوتے ہیں، تو قرآن مجید میں یہ آیت بھی ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ

مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے (فتح : ۱) اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ نبی سے فروگذاشتیں ہوسکتی ہیں، مگر عصیان اور گناہ کی نہیں، بلکہ انسانی بھول چوک کی ہوتی ہیں جن کی اصلاح اللہ تعالیٰ کرتا رہتا ہے، اس قسم کی باتوں کا تعلق فہم، ادراک، تدبر اور زاویۂ نگاہ سے ہوتا ہے، ان میں مناظرانہ رنگ پیدا کرنا صحیح نہیں ہے۔

ایک نوجوان مقالہ نگار نے سید صاحبؒ کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے آخر میں کہا کہ ان کے مذہبی نظریات و افکار اور دینی شعور بالواسطہ طور پر فرقہ پرست عناصر کیلئے نظریاتی اساس پیدا کرتے ہیں، فرقہ پرست، رجعت پسند، بنیاد پرست، دایاں بایاں بازو، فاشسٹ اور ریڈیکل وغیرہ جیسی اصطلاحات موجودہ سیاست میں سیاسی استحصال، بلکہ سیاسی حریفوں کا منھ بند کرنے کی خاطر وضع کی گئی ہیں، یہ سیاسی دنگل میں اکھاڑ پچھاڑ کے لیے تو ٹھیک ہیں، مگر علمی اور تاریخی مجلسوں میں آکے سوچنے کا انداز دوسرا ہونا چاہیے، سید صاحبؒ کی سیاسی زندگی، اسلام کے ضمیر اور سفیر اور سیرۃ النبیؐ کے مصنف کی حیثیت سے رہی، ان کا مسلک یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ خدا اور قیصر الگ الگ ہیں، اس لیے دونوں کے حقوق الگ الگ ادا کیے جائیں، اس میں سچائی کے بجائے سیاسی بازی گری بلکہ سیاسی چنگیزی زیادہ ہے۔

سیمنار میں اس پر بھی بحث تھی کہ الہلال میں سید صاحبؒ کے مضامین، مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین کے مجموعہ میں کیسے شامل کر دیے گئے، یہ بھی موضوع تھا کہ سید صاحبؒ کے نجی خطوط دارالمصنفین سے اب تک کیوں نہیں شایع کیے گئے، پھر اس میں بھی گرما گرمی پیدا ہوئی کہ سید صاحبؒ کانگریسی تھے یا مسلم لیگی؟ پاکستان کیوں گئے؟ دارالمصنفین کیوں چھوڑا؟ جو باتیں ہوچکیں ان کو تاریخ کا اٹل فیصلہ سمجھنے کے علاوہ کیا چارہ ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث ہوتی رہے کہ حضرت سید صاحب علم و فن کو کیا دولت دے گئے، اس سے آیندہ کی نسلیں کیا فوائد اٹھا سکتی ہیں۔

سید صاحبؒ کی تصانیف اور دوسری یادگاروں کی بھی نمایش تھی جس کا افتتاح اس خاکسار کو کرنا تھا، مگر اس نے تیغ جناب سید مظفر [illegible] کے ہاتھوں میں دے دی کہ اس موقع کے لیے انہی کی ذات عالی زیادہ موزوں تھی، سیمنار مختلف دعوتوں اور ایک پُر کیف شام غزل کے بعد جناب ملک رام صدر انجمن، ڈاکٹر خلیق انجم اور ان کے اسٹاف کی مساعی جمیلہ سے ہر طرح کامیاب رہا، جس کے لیے دارالمصنفین کی طرف سے ہم ان کو ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مقالات

سرسیّد احمد خان اور مستشرقین

از عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۳)

غلامی | سر ولیم میور کا ایک اعتراض اسلام میں غلامی کے مسئلہ پر بھی ہے، جس کے جواب میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ :

"اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی نسبت کچھ اعتراض کریں، کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰؑ کا یا اس زمانے کے رسم و رواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو" (خطبات احمدیہ ص ۲۹۴)

عیسائیوں کے یہاں غلامی کا رواج اس قدر تھا کہ بقول گاڈفری ہیگنز انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے، مثلاً اس میں جہاں کہیں لفظ "سروس" یا "ڈولوس" پایا جاتا ہے اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے، وہاں اس کا ترجمہ "غلام" ہونا چاہیے، لفظ "سروس" کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو، اور "فرید یشین" ہمارے اجرت دار اور خدمتگار کے

ہم معنی ہے، لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جائے تو اس سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا، اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔ (ایضاً ص ۲۶۵) گاڈفری ہیگنز یہ بھی کہتے ہیں کہ "مگر حضرت محمدؐ (جنھوں نے غلامی کے مٹانے کے لیے نہایت عمدہ ترکیبیں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے، حضرت محمدؐ تو فرماتے ہیں کہ ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کر دیں تاکہ اپنے آپ کو آزاد کر لیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو، اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو۔" گاڈفری ہیگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔ (ایضاً ص ۲۶۷) لیکن سرسید مرحوم کا خیال ہے کہ:

"جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے پھر رہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے، (ایضاً ۲۶) اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈفری ہیگنز نے کیا ہے ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے، خدائے تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف صاف فرمایا ہے کہ (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ) سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں ۔۔۔۔ اور اس لیے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا، یہی اخوت اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مر جاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لیے چلا جاتا ہے، کتابت کا جو ذکر گاڈفری ہیگنز صاحب نے کیا ہے' وہ حکم صورت ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو، بلکہ اس کا کرنا واجب تھا، اور انکار کرنا قابل سزا کے تھا، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انسؓ سے کتابت کی درخواست کی تو انھوں نے انکار کیا، ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا، حضرت عمرؓ نے ۔۔۔۔ خط آزادی بمعاوضہ حضرت انسؓ سے لکھوا دیا ۔۔۔۔" (ایضاً ص ۲۶۹)

سرسید غلاموں کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے بخاری کی یہ روایت بھی درج کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ تمھارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمھاری خدمت کرتے ہیں، تمھارے کاموں کو سنوارتے ہیں، اللہ نے ان کو تمھارا تابع کر دیا ہے، پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلا دے اور جو آپ پہنتا ہو اس میں سے اس کو پہنا دے، اور ان سے ایسی تکلیف کے کام نہ لے جو ان کو تھکا دیں، اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکا دے تو خود ان کی مدد کرے (بخاری باب قول النبیؐ العبید اخوانکم ص ۳۴۶)

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ:

"اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے، اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے، اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے، اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے، اور باری باری نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے، خلیفہ عمرؓ اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا، عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے، فاطمہؓ، پیغمبرؐ کی بیٹی، اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں کبھی ان کا دست مبارک ہتھے کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لونڈی کا، تاکہ دونوں کو برابر محنت پڑے"

پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو ابتر بنانے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے، ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زائد از حد ترقی متصور ہے، پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی، قیاس کرنا محض غلطی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا، بلکہ

ان کی نسبت لونڈی و غلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے ان کی حقارت نکلتی تھی منع فرمایا، اور نہایت شائستہ، مہذب و شفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی .... علاوہ اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔" (ایضاً، ص ۲۷۱ - ۲۶۹)

جو لوگ قدیم رسم جاہلیت کے مطابق غلام ہو چکے تھے، زرِ معاوضہ لیے بغیر ان کو بطور احسان کے آزاد کرنے کا حکم اسلام نے نہیں دیا، وہ بدستور ان لوگوں کی ملک میں رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے، اس کی وجہ کیا تھی؟ سرسید مرحوم اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعتہً کیوں نہ آزاد کر دیا، تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج نہیں ہے، مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں اس قدر تو ضرور تسلی ہو گی کہ ان بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے، اور ایسا رحم و شفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے، اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں، اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں، ہاں بلاشبہ جو سمجھ دار اور دانشور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے، ان کی آزادی کا دفعتہً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا، اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جائے، اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے، پس یہی کام اسلام نے کیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے، بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔" (ایضاً، ص ۲۷۲)

قرآن مجید کی آیت (فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا .... فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً) (سورہ محمد ۴) کی تفسیر میں علمائے دو مختلف راہیں اختیار کی ہیں، اہل کفر سے مقابلہ میں اگر کچھ قیدی ہاتھ آ جائیں تو بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ان کو صرف اسی وقت چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں، اور بعضوں کی یہ رائے ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جائے، اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں رہیں یا اگر چاہیں تو اپنے ملک چلے جائیں، سرسید مرحوم کے خیال میں یہی رائے بظاہر معقول اور زیادہ مستند، معتبر اور صحیح ہے کہ قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑ دیتے ہیں، کوئی قید اور شرط نہیں لگائی گئی ہے (ص ۴۴، ۴۲)

وہ سر ولیم میور کو یہ جواب دیتے ہیں کہ:

"بقول مسٹر ہیگنز کے گو حضرت مسیحؑ نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو، مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمۃ للعالمینؐ نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا، تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا، اور جو قدیم زمانے کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی، اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰؑ نے بھی بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا، اور جن کو حضرت مسیحؑ نے بھی نہیں توڑا تھا، اور جن کو حضرت مسیحؑ کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا، دفعتہً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور سطول قانونوں کو ایک دو لفظ کے فرمانے سے کہ "اِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً" مٹا دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانۂ چند ملت بشست

(قرآن مجید میں) کافروں کے مغلوب ہو جانے پر ان کے قید کرنے کے حکم کا مقصد ان کی جان بچانا ہے اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے، ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے فدیہ لے کر چھوڑنے میں، جب دو حکم دیے جاتے ہیں تو دونوں میں سے ایک کا بجا لانا واجب ہوتا ہے، یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں، پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل در آمد کرنا واجب ہے، ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے

دیے، رقیت یعنی قیدیوں کا لونڈی اور غلام بنانا بالکل نیست و نابود ہو گیا ہے، ہاں یہ بات ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو، اس وقت تک اس کو قید رکھے، مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہوگا، اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو در حقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی، اور اسی لیے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی (ایضاً—۲۸۳)

عیسائی قوموں میں غلامی کا رواج پہلے بھی تھا، اور اس وقت بھی بعض بعض ملکوں میں ان کے یہاں یہ دستور آج تک چلا آتا ہے، سرسید مرحوم کے زمانہ میں کچھ پس ماندہ مسلم ریاستوں میں بھی اس "رواج" کی خبریں ملا کرتی تھیں، چنانچہ وہ اس کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"جس نالائقی اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (اور بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے، اس کو دیکھ کر ہم اس خطبے کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے، وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے، اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا، خواہ کہیں جاکر یہ کام کرے یا مدینے میں۔" (ایضاً: ص ۲۷۵)

اسلام میں آزادئ رائے

سر ولیم میور کے نزدیک "اسلام میں مذہب کے بارے میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے، بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے"۔ مگر سرسید مرحوم فرماتے ہیں کہ سر ولیم میور کی اس رائے کا ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادئ رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے، اور دوسرے مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ اپنے تاریخی مضامین سمیت، باوجود اس کے کہ ان کے مصنف بھی معلوم نہیں، وحی آسمانی ہیں، اور اس لیے سہو و خطا و غلطی سے بالاتر ہیں، اور ہر ایک انسان کو

کسی تامل، یا کسی حجت، یا اپنے قوائے عقلیہ کا استعمال کیے بغیر ان کے حق ہونے پر یقین کرنا چاہیے۔

کتب مقدسہ کے بارے میں عیسائیوں کے دو فرقے ہیں، ایک وہ جو کتاب مقدس کے تمام و کمال وحی ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں، اور دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو جو مسائل و احکام سے متعلق ہے، وحی سمجھتا ہے، اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا، مگر اس اختلاف سے قطع نظر ان سب کے لیے دو بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے، جن کی وجہ سے مذہبی معاملات میں آزادئ رائے کامل طور پر نیست و نابود ہو جاتی ہے، اس لیے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں، وہ دو بڑے مسئلے یہ ہیں:

ایک مسئلہ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کا ہے، یہ ایک عجیب مسئلہ ہے جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے، خدا کے تین مقدس جسموں کے اظہار کے لیے تثلیث کا لفظ دوسری صدی عیسوی تک (جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا) جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل نائس یا نائسیا میں بھی (جو حضرت عیسیٰؑ کے ۳۲۵ برس بعد ہوئی تھی، اور جس میں ایریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا) طے نہیں ہوا تھا، اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے، کیونکہ پارسن اور دوسرے مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس سے خاص اس مسئلہ میں استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے، پس اگر نہایت عجیب و مشکل اور خلاف عقل مسائل پر یقین کر لینے ہی کو اعتقاد کی خوبی قرار دیا جائے تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا، اور کسی کے لیے عیسائی کہلانے اور خدا کی بارگاہ میں عیسائیوں کی طرح حقوق حاصل کرنے سے پہلے اس عجیب و غریب مسئلہ پر پختہ یقین کرنا لازمی ہوگا، بقول سرسید احمد خان:

"تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے بالکل برخلاف ہے، تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار و معطل چھوڑ کر، نہایت اصرار و تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے۔"

دلیل و عقل کو اس میں دخل دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔" (ایضاً: ص ۲۷۷)

دوسرا مسئلہ فدیہ کا، یعنی حضرت عیسیٰؑ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے، اور یہ بات قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے، جس سے معاملات مذہبی میں آزادیٔ رائے بالکل ختم ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا، اس کے لیے بدی اور بداخلاقی کے دروازے کھل جاتے ہیں، کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا۔ (ایضاً ص ۲۷۷) بہرحال یہودی اور عیسائی مذاہب میں آزادی رائے کے معدوم ہونے بلکہ خلاف عقل عقیدہ رکھنے کی کسی قدر تفصیل کے بعد سرسید مرحوم نے یہ واضح کر دیا ہے کہ:

"مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے، بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے، اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں ..... ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب خصوصاً مذہب عیسائی کے فیاض اور دانشمند، بے تعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں، مشہور و معروف فرانسیسی عالم ایم ڈی سینٹ ہلیر نے لکھا ہے کہ "اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے، مذہب اسلام خود اس بات کا مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے، اور اگر اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے، کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے۔" (ایضاً: ص ۲۷۹)

انھوں نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ دین محمدی کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت، راویوں اور روایت کے مضمون کی نسبت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصبانہ رائے اور تحقیق کے بعد نامعتبر

ٹھہرانے کا ہر شخص کو کلیۃً اختیار ہے، جو روایتیں کہ غور و فکر اور نہایت تحمل اور بردباری سے تحقیق کے بعد عقل اور قدرت کے خلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں، یا جو روایتیں اور حدیثیں بے سند ہوں ان سب کے رد کر دینے کا کلیۃً مجاز ہے، قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں، مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے، کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، ہم نے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اس کی سچائی ثابت ہونے ہی پر مانا ہے، مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی حاصل ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پاوے اس پر عمل کرے، اسلام میں ایسی قوت کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے، مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے یعنی خدا کا وجود اور اس کی وحدانیت، وہ بھی عقل کی مداخلت کے بغیر، اندھا دھند اعتقاد اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے، کیونکہ خود قرآن مجید اس بڑے مسئلہ کو جبر وسختی و ناسمجھی سے نہیں بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے، قرآن مجید میں سب سے پہلے خدائے تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اس کے بعد اس لازوال ہستی اور ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے، پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقے پر بیان کی ہیں، پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ (ایضاً ص ۲۸۰ - ۲۸۸ ملخصاً)

تلوار کی کاٹ اسلام پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کو قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے، مگر جیسا کہ سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

(یہ اعتراض) منجملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کیے ہیں، یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں، یا وہ حق پوشی کی نظر سے دیدہ و دانستہ باندھتے ہیں، اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے، اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہو سکتا، یہ خیال

کہ اسلام زبردستی اور تلوار سے پھیلایا جاتا ہے، قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ "دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے، کیونکہ سیدھی راہ گمراہی سے علانیہ کھل گئی ہے۔ (بقرہ: ۲۵۰)

جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں، جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا، اور پھر جہاں گئے وہاں بھی تعاقب میں دوڑے، اس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے، مگر اسی وقت تک جہاں تک یہ مقصد حاصل ہو جائے، تاکہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ و تلقین خدائے واحد کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھا دیں، ..... ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے، نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے، وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ تنہا اسی مقصد کے حاصل ہوتے ہی تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو۔ جس اصول پر حضرت موسیٰؑ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی، کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثناء کے قتل و غارت و نیست و نابود کر دیں، اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا، اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا۔" (ایضاً ص ۹۰ - ۲۰۸)

دوسرے مذہبوں کے لیے آزادی

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کو آزادی نہیں دی گئی ہے، چنانچہ سرسید یہ بتاتے ہیں کہ اسلام میں تلوار کا استعمال محدود مقاصد کے لیے تھا، اور وہ یہ کہ مسلمان امن سے رہیں، خدائے واحد کی پرستش کیا کریں، خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں، اور اپنے چال چلن اور عادت و عبادت و محبت و رحم دلی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلا دیں، اور اس کی

تین[۳] ہی صورتیں ممکن ہیں:

ایک ہی مذہب ہو جائے اور لوگ مسلمان ہو جائیں، جیسا کہ مدینہ میں ہوا، دوسری صورت یہ ہے کہ صلح رہے، کفار فرائض مذہبی کی ادائگی پر معترض نہ ہوں، جیسا کہ ابتداءً مکہ میں تھا، یا جس طرح کہ مسلمان حبشہ میں ہجرت کے بعد امن سے رہے، یا کسی جنگ کی صورت میں کفار صلح کے طور پر تسلیم کر لیں کہ مسلمانوں کو ملک میں رہنے، آمد و رفت رکھنے، ان کی جان و مال کی حفاظت اور فرائض مذہبی کی ادائگی میں ان پر معترض نہ ہوں گے، تیسری صورت یہ ہے کہ ملک فتح ہو جائے اور فرائض مذہبی کی ادائگی اور اعلائے کلمۃ اللہ پر مسلمانوں سے تعرض کرنے کی کسی میں کوئی طاقت ہی باقی نہ رہے، اس کے بعد جیسا کہ سرسید مرحوم نے تصریح کی ہے:

"ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے، گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو، اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقے میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا، ہر شخص کو آزادی حاصل رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہونچائے، اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے۔" (ایضاً: ص ۲۹۱)

سرسید اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ "مسلمان فتحمندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا" مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے، بلکہ ہم کو یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ انھوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں، اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہو گی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے، مگر وہ مسلمان فتحمند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے، دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے، اور اپنی تمام رعایا کو ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے، چیمبرز ان سائیکلوپیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرفدار ہو، اسپین کے علم تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے

جس میں یہ ہے کہ :

" اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات بیان کے قابل ہے، کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان کے بادشاہوں میں بڑی خوبی پائی جاتی ہے یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دینا " (ایضاً ص ۲۹۲)

مذکورہ بالا اعتراض کے جواب میں سرسیدؒ نے ایک مسیحی عالم گاڈفری ہیگنز کی یہ رائے بھی درج کی ہے کہ " کوئی بات ایسی عام نہیں ہے، جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت، یہ عجیب نعم اور محض ریاکاری ہے، وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے اس لیے جلا وطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب نہیں قبول کرتے تھے، اور وہ کون تھا (عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دیدیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے مسلمانوں نے اس کے برخلاف یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں، اور ان کے مذہب، ان کے پادریوں، ان کے بشپ، ان کے بزرگوں، ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے، جو لڑائی بالفعل (یعنی مسٹر ہیگنز کی اس تحریر کے زمانہ میں) یونانیوں اور ترکیوں میں ہو رہی ہے اور بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ڈیمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے، یونانی اور حبشی اپنے نعمتمندوں کی اطاعت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے، جب کبھی خلیفہ فتحیاب ہوتے تھے، اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے تو فوراً ان کا رتبہ بالکل نعمتمندوں کے برابر ہو جاتا تھا، ایک نہایت دانشمند عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ " وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے، اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش و خرم تھے "

گاڈفری ہیگنز نے اسپین سے مور مسلمانوں کے جلاوطن کیے جانے کے بارے میں ایک دلچسپ مگر حقیقت پسندانہ بات یہ بھی لکھی ہے کہ :

" اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلا وطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے، مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب اور ہی تھا، یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے، اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی، وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا، جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے، وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی، ایرانی، اسپین، خواہ ہندو قتل نہیں کیے جاتے تھے، جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے، بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن و امان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیے جاتے تھے، اور اس پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا، خلفاء کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ عیسائیوں میں مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا، اور نہ کوئی مثال بھی ایسی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑنے کے سبب جلایا گیا ہو، نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانۂ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا " (ایضاً ص ۲۹۵)

جزیہ کے بارے میں ہیگنز کے خیال کی تردید

ابھی مذکورۂ بالا اقتباس میں گاڈفری ہیگنز کا ایک فقرہ یہ تھا کہ (مفتوح قوم کے غیر مسلم) پچھلے حق کی بابت ایک محصول دیتے، اس جملے سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم رعایا کو اپنے مذہب پر باقی رہنے کی وجہ سے اس کے معاوضہ کے طور پر جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا، حالانکہ جزیہ کی یہ توجیہ درست نہیں، چنانچہ سر سید احمد خاں مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

" مسٹر ہیگنز نے یہاں غلطی کی ہے، کافروں میں جو مفتوح ہو جاتے ہیں، اس معاوضہ میں کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے، جزیہ نہیں لیا جاتا ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بے تنخواہ یا قلیل تنخواہ پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیے جاتے اور حکومت اسلامی کے قائم رکھنے اور امن و امان کے

بحال رہنے کے گورنمنٹ کے مقصد اور غرض میں کوئی خدمت بجا نہیں لاتے بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ و امن کی ذمہ دار ہوتی ہے، ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے، بلکہ خلیفہ کو ملکی مصلحت کے پیش نظر بالکل اختیار ہے، چاہے لے، چاہے نہ لے، پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے، نہ مذہب سے، مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے، یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔" (ایضاً ص ۲۹۴ ـ حاشیہ)

اسلام کی دی ہوئی مذہبی آزادی اور عیسائیوں کا طرز عمل

اسلام میں دوسرے مذہبوں کو آزادی دی گئی ہے، لیکن اس کے برخلاف عیسائیوں کا طرز عمل بڑا افسوسناک رہا ہے، چنانچہ جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب "اپالوجی" میں لکھا ہے کہ "نائیسا کی کونسل میں کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس سے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے، یعنی خوں ریزی اور بربادی، ان احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے قریباً دو سو[200] برس تک ترکوں پر کیے تھے، اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے، ان لوگوں کا قتل جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے، لوتھر کے پیروں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا، وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی نے دیا، فرانس میں سینٹ بارتھ لومیو کا قتل ہونا، اور چالیس[40] برس تک اور دوسری بہت سی خوں ریزیوں کا ہونا، فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک، عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا جو اب تک قابل نفرین ہے، کیونکہ وہ عدالت کے حکم سے ہوا تھا، اس کے علاوہ دوسری بے انتہا بدعتوں اور ان بیس[20] برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے، زہر دے کر یا دوسرے طریقوں سے قتل کی وارداتیں، تیرہ، چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوے جو ہر قسم کے گناہ، عیب اور بدکاری میں ایک نیرو یا ایک گیلیکیولا سے بڑھ کر تھے، اور آخر کار

اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لیے قتل ہونا، ایک ایسا مکروہ اور تقریباً ایک غیر منقطع مذہبی لڑائیوں کا سلسلہ جس کے بارے میں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ چودہ سو برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا، اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنا پر نہیں بہایا (ایضاً، ص ۲۹۷)

لیکن عیسائیوں کے برعکس مسلمانوں کا دوسرے مذہب والوں کے ساتھ جو برتاؤ تھا، اس کے بارے میں سرسیدؒ نے مشہور مورخ گبن کا یہ اعتراف درج کیا ہے کہ:

"آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں، ان سے خلفائے نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی، ... ملک عرب میں جو حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا، بہت سے دیوتاؤں کے ماننے والے، اور بت پرست جو ان کو مانتے تھے شرعاً نیست و نابود کیے جا سکتے تھے، مگر انصاف کے ذریعہ سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی، ہندوستان کے مسلمان فتحمندوں نے اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا۔" (ایضاً ص ۲۹۸)

وہ ایک دوسرے مصنف کے آرٹیکل سے جو ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں شایع ہوا تھا، یہ اقتباس بھی پیش کرتے ہیں کہ:

"اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی، کسی کو ایذا نہیں پہونچائی، کوئی مذہبی عدالت، مخالف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی، اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا، ہاں اس نے اپنے مسائل کو جاری کرنا چاہا مگر ان کو بزور جاری نہیں کیا، اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتحمندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے،

اور مفتوحہ سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں، جو ہر ایک فتحمند نے ابتداء سے حضرت محمدؐ کے زمانے تک ہمیشہ قرار دی تھیں۔" یہی مصنف مزید یہ بھی لکھتا ہے کہ "فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔" اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعن کیا ہے کہ وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔" (ایضاً: ص ۲۹۹)

مندرجۂ بالا اقتباسات پیش کرنے کے بعد سرسید فرماتے ہیں کہ:

"اب دیکھو کہ بہت سے نامور، نامدار، فیاض طبع، عیسائی مصنفوں کی یہ رائیں سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے سے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے، کتنی مختلف ہیں"

(ایضاً ص ۳۰۰)

سرسید نے مذکورہ اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ان وسیع تر فائدوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اسلام کی وجہ سے دوسرے مذاہب کو پہونچے، اس نے دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کے یہاں جو ناقص اور نامکمل پہلو رہ گئے تھے، ان کی تکمیل کی، اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاکیزہ لوگوں سے نہایت بد اخلاقی کے افعال قبیحہ کو منسوب کرتے تھے، جن کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا، اسلام نے ان خدا پرست لوگوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا، اور ان کے معصوم اور بیگناہ ہونے کا اعلان کیا، اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کیا، حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ، اور ان کی بیٹیوں، حضرت اسحاقؑ، حضرت یہوداؑ، حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹیوں، اور ہارونؑ، داؤدؑ و سلیمانؑ وغیرہ کی ان کے ہاں باوجود نبی ماننے، مذہبی رہنما تسلیم کرنے اور مقدس جاننے کے ایسی تصویر پیش کی جاتی تھی جیسے کہ وہ مجرم جن کو دائم الحبس کرکے کالے پانی بھیجتے ہیں، یا ان کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں، یہ صرف اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام

بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے، یہود عیسائیوں کے مقدس بزرگوں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کے منکر، مخالف اور دشمن تھے، جن کی طرف سے اسلام نے صفائی پیش کی، جو عیسائیوں پر ایک بڑا احسان ہے، اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات سے نجات دی اور عیسائیوں میں زندگی کی روح پھونک دی، ورنہ آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے، جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقے کے لوگ ہیں، درحقیقت لوتھر نے اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی جس پر اس کے مخالف اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا، تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا، اور آخر کار وہ عظیم الشان اصلاح کرنے پر قادر ہوا، جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے، اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے آزاد کر دیا، ہم کو یقین ہے کہ اگر "لوتھر مقدس" اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے، اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰؑ نے بھی تلقین کیا تھا، لوگوں میں پھیلاتے، اور آخر اس نبی آخر الزمانؐ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا، پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے" (ایضاً ۳۰۱، ۳۰۰م)

کچھ مذہبی کتابوں کے بارے میں

ابتدائے عہد اسلام تدوین علوم کا دور تھا، جس میں ہر طرح کے علوم و فنون کی تدوین ہوئی، کچھ لوگوں نے ثقہ راویوں کے بیانات قلمبند کیے، کچھ نے ثقہ اور غیر ثقہ، صادق و کاذب ہر طرح کے راویوں سے حاصل کردہ معلومات یکجا کر دیں، اور ان کے راویوں کا ذکر بھی درج کتاب کر دیا، کچھ مصنفین کی غرض نہ تو کسی قصے کی تصدیق تھی، اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقعہ کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے، اس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں، اور ان قصوں کی صحت یا عدم صحت کی چھان بین پڑھنے والے کی جانفشانی اور تحقیق اور رائے پر چھوڑ دیں، بعد کے علماء نے متن اور راویوں پر نظر کرکے صحیح، ضعیف، اور موضوع روایتوں

کے الگ الگ مجموعے تیار کیے، اور راویوں کے حالات میں مفصل کتابیں تحریر کیں، جس کی وجہ سے اب صحیح اور غلط کی تمیز کا کام آسان ہوگیا، اور یہ واضح ہوگیا کہ کون سی کتابیں اور کون کون سے راوی معتبر ہیں، اور کون غیر معتبر، روایت کے قبول کرنے کے بارے میں سرسید مرحوم فرماتے ہیں:

"جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں، ان میں کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا ضرور لحاظ ہونا چاہیے، راوی نے صاف اور صریح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی، سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا تک غیر منقطع (یعنی مسلسل) ہو، پیغمبر خدا سے لیکر اخیر راوی تک جملہ راوی تقوی اور تدین اور نیک اعمال کے لیے مشہور ہوں، ہر راوی کو اپنے ماسبق راوی سے ایک سے زیادہ حدیثیں پہونچی ہوں، ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو، تاکہ یہ امر متیقن ہو جائے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا، اور دوسروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا، وہ قرآن مجید میں درج احکام یا قرآن مجید سے معلوم ہونے والے مذہبی عقائد یا مستند حدیث کے مضمون سے متناقض (مخالف) نہ ہو، اس میں عجائب و غرائب، دور از عقل بیان نہ ہوں، بلکہ مفہوم حدیث ایسا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو، کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدۂ مذہبی کی بنیاد بن سکتی ہے، لیکن اگر وہ حدیث ایک ہی شخص کی روایت ہے تو مفید یقین (یعنی عقیدہ کی بنیاد) نہیں ہو سکتی، بلکہ افادۂ ظن کرتی ہے۔" (خطبات احمدیہ: ص ۳۵۴)

اسی بنا پر علمائے اسلام نے احادیث کی قسمیں، ان کے درجات، قبول کی شرطیں، کتب احادیث کی تفصیل، ان کے درجہ، معیار کی وضاحت، راویوں کی قسمیں، ان کے تفصیلی حالات، سب ہی پر کام کیا ہے، اور حق اور ناحق، صحیح اور غلط کی تمیز، قرآنی احکام، قرآنی عقائد، مستند احادیث اور غیر معتبر روایات پر اتنا زبردست کام ہوا ہے کہ اب مسلم اور غیر مسلم محقق کے لیے اصلیت کا پتہ لگانا کچھ بھی دشوار نہیں، مگر مستشرقین رطب و یابس میں تمیز نہیں کرتے، اور نہ ہی راویوں کے حالات اور روایت کے معیار سے کچھ غرض رکھتے ہیں، بلکہ وہ بقول سرسید مرحوم:

"ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے ان حالات کو منتخب کرنے میں یورو پین مصنفوں نے اس قدر متحملانہ تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے جو اس مضمون کی عظمت کے شایان ہے، بلکہ برخلاف اس کے بغض اور تعصب کی وجہ سے انھوں نے دیدہ و دانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے، جس کی شعاعیں ان کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں، اور اس طرح پر انھوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ "کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ جو ارادۃً نہیں دیکھتے۔" (ایضاً ص ۳۲۲)

مقدس جھوٹ غلط روایات کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں علمائے اسلام اور علمائے مسیحیت یا مستشرقین کے درمیان ایک بنیادی فرق سرسید مرحوم کے نزدیک یہ بھی ہے کہ:

"علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے مذہب کے عقائد میں قرار نہیں دیا، بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے، اور اس لیے انھوں نے جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو، گو کیسے ہی پاک اور نیک ارادے سے انھوں نے ایسا کیا ہو، جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی، مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے باطنی عقائد کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔" (ایضاً ص ۳۴۰)

سرسید مرحوم نے اس بارے میں خود سر ولیم میور کی اردو کتاب "تاریخ دین مسیحی" سے یہ تصریح نقل کی ہے کہ "دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفت گو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے، تو انہی کے بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں، آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے مطابق طریقۂ مذکور تسلیم ہوا، اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی، نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی، لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا، پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں، اس طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقے کی پیروی کرتے تھے تو بھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلے

لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ ماننے لگے، اگرچہ اس کی باتیں بر ملا خود مصنف کی ہوتیں، سو اسی طرح مسیحی جو فلسفیوں کی طرح بحث کرتے تھے، کتاب لکھ کے کسی حواری یا خادم حواری، یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے، ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا، اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا، یہ بات بہت ہی خلاف حق اور الزام شدید کے قابل تھی۔" (تاریخ دین مسیحی حصہ دوم باب ۱۳، مولفہ سر ولیم میور) اسی سلسلہ میں سر سیدؒ نے موشیم کی کتاب تاریخ مذہبی سے یہ عبارت بھی درج کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "میں نہیں کہتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا .... مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس تصور سے مبرا نہ تھے، صریح انکار نہیں ہو سکتا۔" (ایکلیزیاسٹکل ہسٹری باب ۳ ص ۷، مطبوعہ ۱۸۶۰ء) وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "حضرت مسیحؑ کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں، ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے شاید برے نہ تھے، بلکہ وہ وہمی، سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے، اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات حواریان مقدس کے نام سے سارے جہان میں مشہور کی گئیں"

(کتاب مذکور حصہ دوم باب ۲ ص ۳۶)

مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے معیار اور رتبہ سے عیسائی عالموں کی ناواقفیت

دوسرے مذہب والوں یا حکیموں اور فلسفیوں کے مقابلہ میں "مقدس جھوٹ" کا اثر مستشرقین پر بھی پڑا، جو ان کے لیے کوئی مستحسن بات نہ تھی، اس سے مسلمانوں میں ان کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں ہوتی، سر سید مرحوم فرماتے ہیں:

"عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجۂ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں، اور درایت کے تو نام سے بھی وہ واقف نہیں ہیں، وہ جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز بدترین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گئے، اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور

جب کہ ان کی یہ ایذا انتقار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گذرتی ہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مصنفین کی بے علمی اور تعصب پر جو ان کی تصنیفات سے مترشح ہوتی ہے ہنستے ہیں اور ان کی بے فائدہ صرفِ اوقات پر افسوس کرتے ہیں۔" (خطبات ص ۳۵۶)

ڈاکٹر اسپرنگر

ڈاکٹر اسپرنگر کے بارے میں بھی ان کی رائے یہ ہے کہ "اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے، اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے اس مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی میں پڑا ہو اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر گیا ہو، اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو۔"

(خطبات ص ۳۵۷)

روایتوں پر سر ولیم میور کے اعتراضات

تاریخ اور سیرت کے بارے میں دور اول کے مسلمانوں کی روایتوں پر سر ولیم میور نے بڑی تفصیل سے اعتراضات کیے ہیں اور سر سید مرحوم نے ان کے جوابات بھی بڑی وضاحت سے دیے ہیں، اس بارے میں انھوں نے پہلے تو سر ولیم میور کے طرز فکر پر ان الفاظ میں شکوہ کیا ہے کہ:

"ہم افسوس کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا طرز تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحقیق اور جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے پہلے ہی ان کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ یہ سب روایتیں جھوٹی، لوگوں کی محض بناوٹ اور ایجاد ہیں، انھوں نے شروع ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں، وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے، جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشا ہوتا ہے، یا کم سے کم ایسا کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیے۔" (خطبات: ص ۳۵۸)

سر ولیم میور نے ایک بات یہ کہی ہے کہ "ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا، ان کے پیروؤں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ محمد صلعم کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں، جس سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں آئیں، جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لیے واقعات کا کوئی اندازہ سردست موجود نہ ہوتا تو حافظہ کی قوت کو واہمہ کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی۔"

مذکورۂ بالا اعتراض میں اصل نکتہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کی روایتوں کی تعظیم اور احترام و توقیر جو زمانہ مابعد کے لوگوں میں تھی وہ سر ولیم میور کے الفاظ میں "امتداد ایام کا اثر تھا" جو لوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوا ہوگا، سر سید مرحوم فرماتے ہیں کہ:

"اب کہ سر ولیم میور اس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں زیادہ نیک اور پرہیزگار شخص کا کیا حال ہوگا، اگر اس کی ہر بات اور عمل کو دغابازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں، اور جس قدر خراب معنی ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کر سکے ان کے اوپر عائد کریں۔"

وہ سر ولیم میور سے یہ سوال کرتے ہیں کہ "حضرت موسیٰؑ کے تمام معجزات، ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا، ان کا "ید بیضا"، "دریا کا خون کی مانند ہو جانا"، "مینڈکوں کی وبا"، اور دوسرے معجزات جو ان سے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے، بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لیے رستہ کا کھل جانا، من وسلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا، پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدائے تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا، خدائے تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا، اور ان کو "میری منتخب قوم" کے خطاب سے سرفراز کرنا، اور اس قدر برکتیں ان کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو "میرا پہلوٹا بیٹا" کہہ کر ممتاز کرنا، کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے

اختیار کیا ہے، نہیں کہہ سکتے، جن کو اس نبی کے سرگرم پیروؤں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو جنھوں نے "مشکلانہ تعظیم" اور "مشتاقانہ تکریم" کے سبب "امتداد زمانہ" میں اپنے نبی کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا؟ کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰ پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی (جو دراصل سر ولیم میور ہی کے طریق استدلال اور زبان اور اسلوب بیان کے مطابق یہ ہوگی) کہ "ان کی وضع کی شان کو دھیان اور مراقبے سے عروج حاصل ہوا، اور زمانہ ان کے پیروؤں سے ان کو جس قدر دور کرتا گیا، اس عجیب و غریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں سے (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام و سلام رکھتا تھا، زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا، دل میں نادانستہ یہ خیال گذرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل ہیں، اور وہ ایسے سامانوں سے گھرے ہوئے اور آراستہ ہیں جو انسان کے امکان سے باہر ہیں، حضرت عیسیٰؑ اور ان کے عقیدت مند اور سرگرم متبعین کا اس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا، جن میں حضرت عیسیٰؑ کی کراماتی پیدائش اور ان کا (عیسائیوں کے خیال میں) از سر نو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا، یعنی حسب قانون "وحدت فی التثلیث" اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔"

سیرت و تاریخ کے ابتدائی راوی یعنی صحابۂ کرام اپنے کردار اور بلندیٔ اخلاق میں ممتاز ترین افراد تھے، اس لیے سر سید مرحوم بجا طور پر فرماتے ہیں کہ "عقل و فہم کی تنظیم ہم کو اُن لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع ہے جنھوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو، البتہ اس بات سے بھی انکار

نہیں ہوسکتا کہ ہر مصنف کو یہ لازم ہے کہ جب وہ غیروں کی تحریروں اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کرلے ۔"

(ایضاً: ص ۶۰ - ۳۵۹)

سرسیدؒ صاف اور واضح الفاظ میں یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ :

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف ملتفت اور مصروف کردیا تھا ، وہ امر حق کو مانتے تھے ، اور اس جہان فانی کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے ، وہ ایماندار ، صادق القول اور نیک طینت تھے ، اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے اس غرض سے کہ احادیث نبویؐ کا ایک مجموعہ تیار ہوجائے ، دور دراز کے سفر اختیار کیے تھے ، انھوں نے ہر کام وقت کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں ، ان کو بے شمار [illegible] پیش آئیں اور ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو بہ مشکل خیال میں آسکتی ہیں ، مگر اس کے باوجود انھوں نے کبھی اپنے کام سے پہلوتہی نہیں کی ، اور اس کو اتمام تک پہونچایا ، جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو دینی سبب اور مخلصانہ طریقوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی ، اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہوسکتے کہ ان کے افعال کو ریاکاری اور فریب کی طرف منسوب کریں ، اور اس طرح کے بے بنیاد بیان پر کہ "وہ محض بناوٹی ایجاد ہیں" ان تصنیفات کی بے جا تحقیر کریں ۔" (خطبات : ص ۳۶۱)

(باقی)

اسلامی تمدن میں علم کی روایت اور اس سے متعلقہ مسائل

از ڈاکٹر نذیر احمد ، علی گڑھ

(۲)

قرآن کریم کی نسبت سے فن خطاطی کو بڑا عروج نصیب ہوا ، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اسی مصحف کے صدقے میں یہ فن ایجاد ہوا ، اور اس نے اسی کے توسط سے ارتقا کے منازل طے کئے ، در اصل خطاطی وخوشنویسی ہمارے رسم خط کی تخصیص ہے ، ورنہ دنیا کے تمام رسم خطوں کا مقصود محض مفاہیم کا ضبط تحریر میں لانا ہے ، یہ بات اور ہے کہ اگر ہر شخص کی تحریر مختلف ہونے کی وجہ سے تحریر کے ہزاروں لاکھوں نمونے ہر ترقی یافتہ زبان میں مل جائیں گے ، لیکن ان میں بذات خود ایسا ہنر نہ ہوگا جس سے علم کے اصول منضبط ہوسکیں ، اسکے برخلاف عربی وفارسی رسم خط کی بدولت خطاطی وخوشنویسی کا فن وجود میں آیا ، اس میں اسی وسعت پیدا ہوئی ، یہاں تک کہ یہ فن نہایت دقیق علم قرار پایا ، اس کے اصول وضوابط مقرر ہوئے ، اس کے اقسام الگ الگ خواص قرار پائے اس طرح جدا جدا مکاتب وجود میں آگئے ، اب جاننا ہوگا کہ چند سطروں میں اس کے بارے میں کچھ تفصیل درج کردی جائے ،

خط عربی ابتداءً سادہ نسخ تھا ، یہی سادگی حضور اکرمؐ کے فرامین میں موجود ہے منجملہ ان کے حضورؐ کا نامۂ مبارک ہے ، جو حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے نام جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے مجلے میں شائع ہوا ، دوسرا نامۂ مسعود قبط کے بادشاہ مقوقس کے نام ہے ۔

جو پہلی بار مجلہ الہلال قاہرہ میں ۱۹۰۳ء میں چھپا تھا، حضور اکرم صلعم کا فرمان منذر بن ساوی کے نام ہے۔
جو جرمنی کے مجلہ zdmg ج ۱۱، ۱۸۶۳ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا، اسی خط میں دو نمونے مصر
میں برآمد ہوئے، یہ ابتدائی سادہ نسخ رفتہ رفتہ خط کوفی سے نزدیک تر ہوتا گیا، چنانچہ اس نسخ ممزوج بکوفی کا قدیم
ترین نمونہ قاہرہ میوزیم میں محفوظ ہے، یہ ایک مزار کا کتبہ ہے، جو ۳۱ھ کا ہے، دوسرا کتبہ ۴۳ھ
کا ہے، جو بیت المقدس پایا جاتا ہے، ایک تحریر ولید بن ملک ۸۶-۹۶ھ کے عہد کی ملی ہے یہ سادہ خط
جو نسخ اور نسخ ممزوج بہ کوفی کے طرز میں ملتا ہے، رفتہ رفتہ تزئینی شکل اختیار کر لیتا ہے، عباسی دور میں
خطاطی کی بڑی ترقی ہوئی، خلیفہ مامون کے دور کا بڑا خطاط ابو خالد احول تھا، اس نے خطاطی کے
قواعد منضبط کئے، اور اس کی وجہ سے خطاطی کے بہترین نمونے وجود میں آئے، اسی دور کا ایک وزیر فضل بن
سہل سرخسی ذو الریاستین تھا، اس کی توجہ سے خط الریاستی رواج پذیر ہوا، یہی خط چار خطوں کا مبدء ہے
یعنی ثلث، محقق، رقاع، غبار، تیسری صدی ہجری کے خط کی بہترین یادگار ایک کلام مجید ہے، جس کی
کتابت ۲۶۲ھ کی ہے، اور دمشق کے میوزیم میں محفوظ ہے، یہ خط کوفی تزئینی میں ہے، آستان قدس
مشہد میں ایک قرآن ۳۲۰ھ کا مکتوبہ ہے، یہ کوفی خط میں ہے، جو مائل بہ نسخ ہے، اسی آستانے کا
ایک نسخہ سلطان محمود غزنوی کے دبیر ابو الحسن عراقی کا وقف کردہ ہے، جو خط نسخ مائل بہ ثلث میں
ہے، چوتھی صدی میں ایک تزئینی خط وجود میں آیا، جس کو پیر آموز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لیکن
اس دور میں سادہ خط نسخ بھی رائج تھا، آستان قدس مشہد کے گنجینۂ قرآن میں قرآن کا ایک نسخہ
خط کوفی مائل بہ نسخ میں ہے، اس کو سلطان محمود غزنوی کے وزیر ابو القاسم منصور نے ۳۹۳ھ
میں وقف کیا تھا، پانچویں صدی کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں تزئینی خط کے علاوہ تذہیب و تنقیش
بھی ملتی ہے، اس کے سلسلے میں قرآن کے چند نسخے قابل ذکر ہیں، (۱) نسخہ قرآن خط کوفی کاتب محمد عثمان
وراق غزنوی تاریخ وقف آستان قدس ۴۶۶ھ (۲) نسخہ قرآن خط کوفی مائل بہ پیر آموز مجموعہ

چیسٹر بیٹی (۳) نسخہ قرآن خط کوفی باتذہیب کتاب خانہ پیرس مکتوبہ ۵۰۵ھ (۴) نسخہ قرآن
خط کوفی باتذہیب کاتب ابو بکر بن احمد بن عبید اللہ غزنوی، مصر میوزیم کتابت ۵۶۶ھ چھٹی
صدی ہجری میں خط نسخ میں ریحان، رقاع، توقیع کی آمیزش ملتی ہے، اس کی نمائندگی محمد بن عیسیٰ بن
علی نیشاپوری کے قرآن پاک مکتوبہ ۵۸۵ھ سے ہوتی ہے، جو سلطان غیاث الدین محمد بن سام کیلئے
تیار ہوا تھا، اور جو اب ایران باستان کے میوزیم میں محفوظ ہے۔

اسلامی دور کی خطاطی کی سات سو سالہ تاریخ بڑی اہمیت کی حامل ہے، ابتدا میں
نسخ سادہ کا رواج تھا، پھر نسخ آمیختہ بکوفی کا رواج ہوا، پھر کوفی سادہ، پھر کوفی ممزوج بہ نسخ، پھر
کوفی تزئینی، اور نسخ تزئینی رواج پذیر ہوئے، لیکن ان میں جو ذرا سا فرق ہے، اس کے اعتبار کر
الگ الگ نام ہوئے، جن کی تعداد پچاس تک پہنچی ہے، لیکن اوائل تیموری دور میں صرف چھ خط
زیادہ متداول تھے، ثلث، ریحان، محقق، نسخ، توقیع، رقاع، اس کے بعد نستعلیق خط وجود میں آیا جو
فارسی خط ہے، لیکن اس میں بھی قرآن کریم کے نسخے ملتے ہیں۔

قرآن کریم کی آرائش و زیبائش پر جتنی توجہ ہوئی وہ دنیا کی کسی ایک کتاب کا کیا ذکر سارے
ذخیرہ پر نہ ہوئی ہو، ہزاروں فن کاروں نے اپنے ہنر کی نمائش کے لئے قرآن کو منتخب کیا، اس کے نتیجے میں
خود قرآن کے ایسے ایسے نادر نسخے وجود میں آئے ہیں جو اسلامی خطاطی کی تاریخ کے لیے اہم مواد کا کام
دیتے ہیں، لیکن ابھی خطاطی کی تاریخ اس اہم ماخذ کی روشنی میں لکھی نہیں جا سکی ہے، قرآن مجید کے
جتنے نسخے ملتے ہیں، اتنے نسخے دنیا میں کسی ایک . . . کتاب کا کیا ذکر متعدد کتابوں سے مل کر
نہ ہوں گے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب
قرآن مجید ہے، اور اسی پر سب سے زیادہ ہنر صرف ہوا ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام میں ایسے ایسے نئے علوم ایجاد ہوئے جن کا نام و نشان بھی

دوسرے تمدن میں نہیں، اس کے نتیجے میں ہزاروں علما اور لاکھوں کروڑوں کتابیں معرض وجود
آئیں جو موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل نادر تھیں، تہذیب انسانی اسلام کے اس احسان عظیم سے
گراں بار ہے۔

علوم شرعی میں جن امور و مسائل پر علمائے اسلام نے کتابیں تصنیف کیں ان مسائل سے
تہذیب بشری دوچار نہیں ہوئی تھی، اس لحاظ سے یہ دنیائے علم میں زبردست اضافے کا موجب
اور اسی اعتبار سے تاریخ بشر پر اسلام کا احسان عظیم ہے، نئے علوم کی دریافت اور ان سے
متعلقہ امور کا نہایت درجہ عمیق مطالعہ مسلمانوں کا اتنا عظیم کارنامہ ہے، جس کی مثال تاریخ
عالم میں کہیں نہیں مل سکتی، علوم شرعیہ کا یہ رخ حد درجہ قابل توجہ ہے۔

علوم عقلی میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیئے وہ اس لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ پورے
عالم میں اس لحاظ سے ان کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ جب عالم اسلام میں بیت الحکمۃ قائم ہو رہے
تھے اور ان میں اہم علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق انجام پا رہی تھی، یورپ تعلیم کے ابتدائی مراحل
سے بھی نہیں گذرا تھا، مسلمانوں نے یونانی علوم کو عربی میں اس طرح منتقل کیا، اور اس پر بھرپور
اضافہ کرکے ان میں نئی جہتیں پیدا کیں، یونانی علوم کا بیشتر حصہ اصل زبان میں زمانہ کی نذر ہو گیا
تھا، البتہ عربی زبان میں وہ سارا کا سارا محفوظ رہا، اور یہی یورپ میں نشأۃ ثانیہ کا موجب ہوا، اہل عرب کو
اب سارے عالم کی علمی سربراہی حاصل ہوئی، اور ان کی یہ بالادستی کئی صدی تک قائم رہی، چنانچہ
مشرق اور مغرب کے سارے دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر عربوں نے علم کی حفاظت
میں ایسی جان توڑ کوشش نہ کی ہوتی تو یورپ ابھی تک ... دور تاریکی میں ہوتا، تہذیب عالم اسلام
کے بار احسان سے کیوں کر سبکدوش ہو سکتی ہے؟ اب میں جستہ جستہ چند علما کا ذکر کرنا چاہتا ہوں
جن کی وجہ سے یونانی علوم نہ صرف محفوظ رہ گئے، بلکہ ان پر اضافے ہوئے، اور ان کی نئے سرے سے

تجربے اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا، اس طرح وہ لوگ دنیائے علم میں زبردست اضافے کا موجب
بنے، علوم کی ترقی میں خلفائے عباسی نے جو کارنامے انجام دیئے وہ ہمیشہ زندہ اور تابناک رہیں گے،

مشاہیر علمائے ریاضی میں یوں تو کئی نام ملتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ قابل ذکر شخصیت ابو عبداللہ
محمد بن موسیٰ خوارزمی معاصر خلیفہ مامون (۱۹۸-۲۱۸ھ) کی ہے، اس کی کتاب حساب کا عربی متن
مفقود ہے، لیکن اس کا بارہویں صدی عیسوی کا لاطینی ترجمہ موجود ہے، اس کی دوسری اہم کتاب
کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ موجود ہے، یہ کتاب لاطینی اور انگریزی دونوں یورپی زبانوں
میں منتقل ہو گئی ہے، خوارزمی نے ان دونوں کتابوں کے ذریعے اسلامی نقطۂ نظر کو یورپ سے
روشناس کرایا، اہل یورپ اس کو الخوارزم کہتے ہیں۔

خوارزمی کے معاصرین میں محمد بن کثیر فرغانی ہے، جس کے دو رسالے اسطرلاب پر اور ایک
کتاب اصول علم نجوم پر ہے، یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ ہو چکی ہے۔

قرن سوم کے دانشوروں میں بنی موسیٰ بن شاکر قابل ذکر ہیں، ان کی ایک کتاب معرفۃ الاشکال
البسیطۃ والکریۃ موجود ہے، اس کا ایک بیٹا محمد بن موسیٰ ہے، متوفی ۲۵۹ھ، جس کی مشہور تصنیف
کتاب المخروطات ہے۔

اسی دور کا ایک ریاضی دان و منجم عمر بن الفرخان الطبری ہے، جس نے کتاب الاربعۃ بطلیموس
القلوذی کی تشریح لکھی ہے، وہ متعدد کتابوں کا مصنف ہے، اس کی نجوم پر دو کتابیں جوامع الاسرار
وکتاب مختصر باقی ہیں۔

اسی صدی کا سب سے مشہور فلسفی یعقوب بن اسحاق الکندی ہے۔ (۲۵۸ھ) اس کے
تین رسالے موجود ہیں بعض کی اصل عربی باقی ہے اور بعض کے محض لاطینی ترجمے، اس کی اکثر تصانیف
۱۲ویں صدی میں Geradus Cremonesis کے وسیلے سے لاطینی میں منتقل ہوتی تھیں،

کندی یونانی علوم کا زبردست ماہر تھا، اس کے ذریعے سے اصل علوم تک رسائی ہو سکتی ہے، اس کے شاگردوں میں ابو معشر بلخی (۲۷۲ھ) احمد بن طیب سرخسی اور احمد بن سہل بلخی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس دور میں یونانی اور دوسری زبانوں کی علمی کتابوں کے ترجمے ہوئے، ان مترجمین میں ثابت بن قرۃ حرانی کا نام قابل ذکر ہے، اس نے ریاضی، ہندسہ اور طب کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، جو اکثر موجود ہیں۔

اس دور کی طبی تصانیف میں منصور عباسی کے طبیب جورجیس بن بختیشوع کی کتاب الکناس موجود ہے، ابوزکریا یوحنا بن ماسویہ (م ۲۴۳) کی کتاب الحمیات الشجر باقی رہ گئی، حنین بن اسحاق نے یونانی اور سریانی سے طب کی متعدد کتابیں عربی میں منتقل کیں، لیکن تیسری صدی کا سب سے مشہور طبیب ابوالحسن علی بن سہل ابن طبری ہے، اس کی مشہور کتاب فردوس الحکمہ ہے جو طبع ہو چکی ہے۔

چوتھی اور پانچویں صدی علوم اسلامی خصوصاً علوم عقلی کی ترقی کا دور ہے، اس دور میں محمد بن زکریا رازی، ابونصر فارابی، علی بن عباس مجوسی، ابن سینا، ابوریحان بیرونی، ابن مسکویہ، ابو سہل مسیحی، وغیرہ دانشوروں کی وجہ سے علوم اسلامی نے وہ درجہ حاصل کر لیا، جو اسے کبھی نصیب نہ تھا، اور انہی کی کوششوں سے مشرق کو علم کے میدان میں وہ امتیاز حاصل ہوا جو اسے پھر کبھی نہ ملا، اور اسی وجہ سے سارے عالم کی علمی سربراہی کئی سو صدی تک مشرق کے حصے میں رہی، طب، حکمت، ریاضی، جغرافیہ، ایسے علوم میں جن میں مسلمانوں نے نہایت درجہ ناموری حاصل کی اس سلسلے کے بعض مشاہیر کا نام درج کیا جاتا ہے۔

حکمائے بزرگ میں محمد بن زکریا رازی، ابونصر فارابی، ابوسلیمان منطقی، ابن رشد، ابن طفیل، ابوحیان توحیدی، ابن مسکویہ، ابن سینا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، علوم ریاضی میں ابوالوفا بوزجانی، ابوجعفر الخازن الخراسانی، ابوسعید احمد بن عبدالجلیل سگزی، عبدالرحمٰن صوفی، ابوالحسن کوشیار گیلی

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی قابل ستائش ہیں، طب میں محمد بن زکریا رازی، علی بن عباس مجوسی ابوسہل مسیحی جرجانی، ابن سینا کا نام کبھی بھلایا نہیں جا سکتا، علم جغرافیا میں ابوالقاسم محمد بن خرداذبہ ابوالقاسم محمد بن حوقل، ابواسحاق ابراہیم اصطخری، شمس الدین مقدسی، ابوعبداللہ احمد بن محمد جیہانی، ابوالحسن علی مسعودی، ابوزید بلخی، ابوریحان بیرونی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

علم تاریخ میں مسلمانوں نے بڑے کارنامے انجام دئے ہیں، اسلامی تمدن کی برتری کے زمانہ میں بڑے بڑے مورخین گذرے ہیں، ان میں چند کا نام یہ ہے،

ابن اسحاق، سیرت ۷۶۷ء۔ بلاذری، فتوح البلدان ۸۹۲ء۔ ابن قتیبہ کتاب المعارف ۸۸۹ء۔ ابوحنیفہ دینوری، الاخبار الطوال ۸۹۵ء۔ یعقوبی ۲۵۸ ۸۷۲ء حمزہ اصفہانی ۹۶۱ء۔ مسکویہ ۱۰۳۰ء۔ محمد بن جریر طبری تاریخ الرسل والملوک ۳۱۰ھ۔ ابوالحسن علی المسعودی مروج الذہب ۹۵۶ء۔ ابن الاثیر الکامل فی التاریخ ۱۲۳۴ء ۶۳۰ھ۔ ابن خلکان وفیات الاعیان ۶۸۳ھ۔ ابن خلدون ۸۰۶ھ۔ یاقوت حموی ۱۲۲۹ء، ابن خلدون ۸۰۶ھ، ابن عساکر تاریخ دمشق ۵۷۱ھ۔ ابن خطیب بغدادی۔ تاریخ بغداد وغیرہ

ان کے ساتھ فارسی زبان کے چند مورخین کے نام کا اضافہ غیر ضروری نہ ہوگا۔

ابوالفضل بیہقی تاریخ مسعودی۔ گردیزی۔ زین الاخبار۔ عطاملک جوینی، جہان کشا۔ رشید الدین فضل اللہ۔ جامع التواریخ۔

ان کے علاوہ طبقات کے سیکڑوں مولفین کے کارنامے ہیں، جو تاریخ کے اہم ماخذ ہیں، اور جن کے بغیر اسلامی علوم کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

مسلمانوں نے علوم وفنون کی ترقی میں جو قابل ذکر کارنامے انجام دئے ہیں، ان کا اعتراف اہل مغرب نے بھی کیا ہے، چنانچہ ہٹی جیسے مصنف کو یہ قول دہرانا پڑا۔

"بنی نوع انسان کے مخصوص کام مسلمانوں کے توسط سے انجام پذیر ہوئے، عظیم ترین فلسفی الفارابی مسلمان تھا، سب سے بڑے ریاضی دان، ابوکامل اور ابراہیم بن سنان مسلمان تھے، سب سے بڑا جغرافیہ دان اور دائرۃ المعارف بہ صلاحیت کامل مسعودی مسلمان تھا اور سب سے بڑا مورخ الطبری بھی مسلمان تھا۔"

غرض اسلامی تمدن کی علمی برتری ایسے دانشوروں کے کارناموں کی وجہ سے ہے، جن کی اہمیت آج بھی برقرار ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس تمدن کی سب سے زیادہ قابل توجہ تخصیص کتابوں کی کثرت اور تنوع میں ہے، تہذیب بشر میں کسی مخصوص قوم کے یہاں نہ اتنے دانشور ملیں گے، نہ ان کے یہاں علوم و فنون میں اتنا تنوع ہوگا، نہ ان کے یہاں اتنا علمی سرمایہ ہوگا، اگرچہ اس علمی سرمایے کا بیشتر حصہ مفقود ہو چکا ہے، اور جو موجود ہے، وہ مفقود حصے کا محض ایک حقیر جز ہے، اگر کسی طرح مفقود اور معلوم سرمایے کا احاطہ ہو سکے تو معلوم ہوگا، کہ کتابوں کی تعداد کئی کروڑ تک پہنچ جائے گی، ان کتابوں کی ایک بڑی خصوصیت ان کی ضخامت ہے، بعض علما کی کتابیں ۱۰۰ مجلدات سے زیادہ ہیں، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور زکریا رازی کی الحاوی اس زمرے میں آتی ہیں، طبری کی تاریخ الرسل والملوک ۱۵ جلدوں میں لائڈن سے ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء شائع ہوئی ہے، اور اس کی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن، ۴۰ مجلدات پر مشتمل تھی، سامانی امیر ابو صالح منصور بن نوح (۳۵۱-۳۶۵ھ) نے دیکھی تو کہا کہ اتنی ضخیم تفسیر کا مطالعہ میرے بس کا نہیں، پھر اس نے ماوراء النہر اور خراسان کے علما کو جمع کیا، اور اس کے ترجمے کے جواز میں کوئی قطعی فیصلہ چاہا، علما کی ایک جماعت نے غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فارسی زبان میں قرآن کی تفسیر جائز ہے، اس کے چند علما اس کام کے لئے منتخب ہوئے، اور انھوں نے فارسی میں تفسیر طبری کا خلاصہ مرتب کیا، جو ۱۶ مجلدات پر مشتمل تھا۔

امیر خلف بن احمد (م = ۳۹۹) سیستان کا نامور حکمران گذرا ہے، جو ۳۹۳ھ میں محمود غزنوی سے شکست پاجاتا ہے، اس کے بعد محمود کا قبضہ سیستان پر مستحکم ہوتا ہے، امیر خلف نہایت سخی اور عادل بادشاہ تھا، علوم کا بڑا قدردان اور علما و فضلا کا مربی تھا، مشہور مورخ عتبی نے تاریخ یمینی میں اس کے فضائل کے ذکر میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ امیر مذکور نے اپنے زمانے کے مخصوص علما کو جمع کیا، اور قرآن مجید کی ایک ایسی مفصل و جامع تفسیر لکھنے کی فرمائش کی جو مفسروں کے اقوال، متقدمین و متاخرین کی تاویلات مختلف قرأتوں کے وجوہ اور نحو کے اسباب کے بیان، اشتقاق لغات، امثال و شواہد نظم و نثر، اخبار و احادیث سے آراستہ ہو، راوی لکھتا ہے، کہ اس کے مولفین کو بیس ہزار اشرفیاں دی گئیں، اس تفسیر کا ایک نسخہ مدرسۂ صابونی نیشاپور میں غزوں کے حملے (۵۴۵ھ) تک موجود تھا، اس کے بعد وہ اصفہان منتقل ہوا، اور آل خجند کے کتاب خانے کی زینت بنا، تاریخ یمینی کے مترجم ابو شرف ناصح جرباد قانی نے اضافہ کیا ہے کہ (اواخر چھٹی صدی ہجری) جب وہ اپنے وطن سے نکل کر اصفہان میں مقیم ہوا، اس نے تفسیر مذکور کا وہ نسخہ دیکھا تھا، سو جلدوں میں تھا، اس کے استنساخ کے لیے ایک عمر درکار ہے، اور اس کام کیلئے نہ جانے کتنے کاتبوں کی ضرورت ہوگی۔

طبری نے علم کی جتنی خدمت کی ہے اس کا اندازہ اس سے ہوگا، کہ اس کی ابتدائے تحریر سے موت تک جو حساب کیا گیا تو ۴۰ ورق فی روز کا اوسط نکلا، عبدالرحمٰن بن الجوزی (م ۵۹۷ھ) کے بارے میں خود ان کے نواسے کا بیان ہے کہ انھوں نے دو ہزار مجلدات اپنے ہاتھ سے لکھے تھے، اور ہر روز ۴ تختے لکھتے اور سالانہ ۴۰ تا ۵۰ مجلد ہو جاتے۔

اسلامی تمدن کی برتری کے دور میں کروڑوں کتابیں لکھی گئیں، چونکہ اس زمانے میں پریس نہ تھا، اس لئے قلمی نسخے تیار ہوتے تھے، مخطوطے اچھے برے سبھی قسم کے تھے، یہ مخطوطے

جہاں بڑے بڑے خطاطین کے فنی کمال کی نمائندگی کرتے ہیں، وہاں پیشہ ور کاتبوں کی لاپروائی داستان اپنی زبان بے زبانی سے دہراتے ہیں، اس طرح لاکھوں کاتب، خطاط، خوشنویس وغیرہ اس کام پر مامور ہوتے، آپ غور کریں جس معاشرے میں کتابوں کی تعداد کروڑوں سے متجاوز ہو، اور وہ سب کی سب قلمی شکل میں ہوں، اور اکثر وبیشتر کا حجم ہزار صفحے سے زیادہ ہو تو ان کے لئے کتابت کے کتنے وسائل درکار ہونگے، جس طرح لاکھوں خطاط اس کام میں مصروف ہوتے وہیں اتنی ہی تعداد میں جدول کش، سیاہی بنانے والے، کاغذ تیار کرنے والے بھی درکار ہوتے، بعد کے دوروں میں مصور بھی وجود میں آجاتے ہیں، وہ بھی قلمی کتابوں کی توضیح کے لیے ان میں تصویر کشی کرتے ہیں، غرض لاکھوں کروڑوں فنکاروں کی پیہم کوشش کا نتیجہ اسلامی تمدن کے کروڑوں مخطوطات ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا معاشرہ تعلیم وتعلم میں مصروف تھا، آپ اگر اس وقت کے اسلامی ممالک کی آبادی کو ذہن میں رکھیں تو دنیائے تمدن میں جو علمی انقلاب ہوا وہ زیادہ عبرت آموز معلوم ہوگا۔ اور موجب صد افتخار بھی۔

مخطوطات کے سلسلے میں چند باتیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ لاکھوں سے زیادہ مخطوطات ضائع ہو چکے ہیں، اور ان کی وجہ سے بہت سا علم بھی ضائع ہوگیا۔ نادر مخطوطات کے ساتھ تو نادر علم بھی دفن ہوگیا۔ عام مخطوطے بھی کسی نہ کسی درجے میں نئی معلومات کے حامل ہوتے ہیں، اس لیے کوئی دو مخطوطے یکساں نہیں ہوتے، اختلاف نسخ میں علم روپوش ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی مخطوطات جو باقی رہ گئے ہیں، وہ اپنی کثرت اور تنوع مضامین کے اعتبار سے دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

۳۔ ہزاروں کتابیں ایسی ہیں جن کی بنیاد محض ایک ہی مخطوطے پر ہے، ایسے مخطوطے نہایت

درجہ قیمتی ہیں، ان کی حفاظت کی فوری تدبیر ہونی چاہئے۔

۴۔ ہزاروں کتابوں کا محض ایک جز محفوظ رہ گیا ہے۔

۵۔ مصنف کے خود نوشت مخطوطے خاصی تعداد میں موجود ہیں، لیکن ان کے مقابلے میں جو ضائع ہو چکے ہیں بہت زیادہ ہیں، اس لیے تقریباً ہر مصنف کوئی نہ کوئی مسودہ ضرور تیار کرتا ہے، اس لحاظ سے خود نوشت مخطوطات کی تعداد مصنف کی تعداد سے کم نہ ہونا چاہئے، لیکن موجود اور مفقود میں ایک اور ہزار کی نسبت سے بڑی نسبت ہوگی۔

۶۔ اسلامی دور کے مصنفین اور قارئین کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ مخطوطات پر دوران مطالعہ اپنی یادداشت ثبت کرتے رہے ہیں، اس سے مخطوطہ کی قدر وقیمت میں اضافہ ہوتا تھا، ذیل میں محض چند ایسے مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے جو یا تو خود نوشت مخطوطے ہیں یا اہم مصنفین کی یادداشت سے مزین ہیں، یہ مثالیں محض نمونۂ مشتے از خروارے ہیں۔

کتاب تفسیر غریب القرآن علی حروف المعجم، تالیف ابو بکر محمد بن عمر بن احمد بن عزیز السجستانی (م ۳۳۰ھ) اس کو مشہور مصنف ابن الجوالیقی (م ۵۳۹ھ) نے ۵۱۴ھ میں پڑھا، مخطوطہ مکتوب ۴۹۹ھ میں بخط زید بن حسن بن زید الکندی (م ۶۱۳ھ) کی یادداشت کے مطابق ربیع الثانی [illegible] میں اس کے مطالعے میں رہا۔ (چسٹر بیٹی، ڈبلن، پلیٹ نمبر۱)

النہایہ فی غریب الحدیث تالیف مجد الدین ابو السعادات المبارک بن محمد بن الاثیر الشیبانی الجزری (م ۶۰۶) مؤلف کا خط (چسٹر بیٹی نمبر۳)

حلیۃ الابرار تالیف محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی (م ۶۷۶) اس کی کتابت نووی کے شاگرد علی بن ابراہیم بن داؤد بن العطار نے ۶۷۴ھ میں کی۔ (ایضاً: نمبر۶)

کشف الالہام، تالیف بدر الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الشبلی بن تیم الشبلیہ (۷۱۲-۷۶۹ھ) خود مؤلف کا نسخہ کتابت رجب ۷۳۸ھ (ایضاً: نمبر۷)

ہدایۃ الساری لفتح الباری، تالیف شہاب الدین ابوالفضل احمد بن علی ابن حجر العسقلانی الکنعانی (م : ۸۵۲ھ) کی کتابت ۸۶۸ھ میں مشہور مورخ القسطلانی (م : ۹۲۳) نے کی۔ (ایضاً نمبر ۱۲)

ادب الکاتب، تالیف ابن قتیبہ (م : ۲۷۰)، تاریخ کتابت محرم ۵۴۳ھ کاتب جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزی (وفات ۵۹۷ھ) عالم اسلام کی اس عظیم المرتبت شخصیت نے ۲۳ سال کی عمر میں اسے نقل کیا تھا۔ (ایضاً: نمبر ۴۲)

احیاء علوم الدین کا یہ نسخہ ۵۶۲ھ اور ۵۷۷ھ میں مشہور مورخ احمد بن یوسف بن الازرق کے مطالعہ میں رہا۔ (نمبر ۴۳)

کتاب شفاء الصدور، تالیف ابوبکر محمد بن حسین بن زیاد المعروف بالنقاش، اس نسخے پر دو یادداشتیں ہیں، ایک شوال ۵۱۳ھ کی جو ابوالبرکات بن المبارک الانماطی (م : ۵۳۸ھ) استاذ ابن الجوزی کے خط میں اور دوسری سند مالک مخطوط کی ہے، جو عبدالمالک بن سعید کے بیٹے تھے۔ (م : ۵۶۰) (نمبر ۴۶)

کتاب الفوائد، تالیف ابوبکر بن عبیداللہ بن محمد بن الشاکر السیرانی (م : ۳۷۸) کے کاتب ابن عساکر مؤلف تاریخ دمشق ہیں، اس پر متعدد یادداشتیں ہیں، ۵۹۶ھ کی تحریر ابن عساکر کے پوتے علی بن القاسم (م ۶۱۶) کی ہے۔ (نمبر ۵۰)

مشارق الانوار، تالیف حسن بن محمد بن حسن الصغانی (م : ۶۵۰) پر خود مصنف کی یادداشت ہے، اس کا کاتب عبداللہ بن محمد بن ابی بکر الغسانی الاندلسی ہے، اس کو خود مصنف کے گھر پر مختلف علماء نے پڑھا، صغانی اصلاً لاہوری ہیں۔ (نمبر ۵۱)

ترجمۂ اقلیدس نصیر الدین طوسی کے شاگرد نجم الدین علی بن عمر قزوینی کے خط میں ہے۔ (نمبر ۵۴)

اطراف الصحیحین تالیف ابونعیم عبیداللہ بن الحسن بن احمد بن الحداد الاصفہانی (م : ۵۱۷) خود مؤلف کے خط میں مکتوبہ ۵۱۱ھ۔ (نمبر ۵۷)

اختیار الاکباد تالیف شمس الدین السخاوی (م : ۹۰۲) اس کے کاتب ابوبکر بن عبدالرحمن بن محمد ابن ابی بکر بن عثمان بن محمد السخاوی الشافعی (م : ۸۹۳ھ) برادر مؤلف۔ (نمبر ۵۹)

ابن القلقشندی (م : ۸۷۱) کے خطبات کا مجموعہ جو ربیع الثانی ۸۵۳ھ میں مسجد جامع ازہر مصر میں دیے گئے تھے۔ (نمبر ۶۰)

ابو خیثمہ زہیر بن حرب النسائی الشیبانی (وفات ۲۳۴ھ) پر ابن حجر عسقلانی (م : ۸۵۲) کی یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کو مجد الدین بن ابراہیم کے ساتھ پڑھا، اور سخاوی کی ایک تحریر سے واضح ہے کہ انھوں نے اس نسخے کو ۱۳ جمادی الثانیہ ۸۵۰ھ میں ابن حجر کے ساتھ مطالعہ کیا۔ (نمبر ۶۴)

اس نسخے میں سخاوی کے خط میں ان کے متعدد معاصرین کے نام ہیں، جو خود صاحب تصنیف بزرگ ہوئے ہیں۔ (نمبر ۶۵)

ابن قتیبہ کی غرائب الحدیث، کتابت ۲۷۹ھ، جو عبدالعزیز بن الحسین بن علی الزبیری کے مطالعہ میں ۵۵۲ھ میں رہی۔ (نمبر ۶۸)

دارقطنی الحافظ (م : ۳۸۵) کی کتاب المجتنیٰ من السنن المطہرہ کے کاتب عبیداللہ بن ابراہیم بن مطہر الدقاق (م : ۶۱۹) ہیں اس پر متعدد فضلاء کی تحریریں ہیں، عماد الدین ابواسحاق ابراہیم بن عبدالواحد ابن علی بن سرور المقدسی کے مطالعہ میں یہ نسخہ ۵۸۰ھ میں رہا، دوسری یادداشت شوال ۶۰۷ھ کی ہے، خط عبدالرحیم بن عبدالواحد بن احمد المقدسی برادر ضیاء الدین محمد المقدسی (م : ۶۴۳ھ) استاذ جو کلاس لیتے ان کا نام موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ المقدسی (م : ۶۲۰) تھا، ایک شاگرد ابوالفتح محمد بن عبدالغنی الجماعیلی (م ۶۱۳) پسر عبدالغنی المقدسی الجماعیلی، (م : ۶۰۰ھ) (نمبر ۷۰)

مخطوطہ نمبر ۳۶۶۴ بخط تقی الدین ابوبکر بن محمد بن ابی بکر البسلامی الحلبی، معروف بہ ابن الحبیش، شاگرد سخاوی، یہ مخطوطہ سخاوی کی بھی تحریر سے مزین ہے۔ (نمبر ۹۱)

جمال الدین ابوالفرج ابن الجوزی (م: ۵۹۷) کی تنظیم کا مخطوط احمد بن عبد الرحمٰن بن احمد بن عبد الرحمٰن بن علی بن یحییٰ بن محمد الشہرزوری کے خط میں ہے، (وفات ۷۰۱) (نمبر ۱۱۰)

ابن فارس (م: ۳۹۵) کے تتمہ فصیح الکلام کا مخطوطہ، یاقوت بن عبد اللہ الرومی الحموی (م: ۶۲۶) کے خط میں (نمبر ۱۳۴) مخطوطہ نمبر ۳۹۹۹۔

اسی مخطوطہ کے جز اول پر یاقوت الحموی کی سنہ ۶۲۰ھ کی تحریر ہے، جس کی تصدیق ابن شداد نے کی ہے (ابن شداد کے لیے دیکھئے بروکلمن)

مختصر کتاب العین الزبیدی، علامہ بقائی کے خط میں، احمد تیمور پاشا کے کتاب خانے میں۔

شرح جوالیقی، ادب الکاتب، تالیف ابن قتیبہ (م سنہ ۲۷۶ھ) شارح کے بیٹے اسماعیل کے خط میں مورخ سنہ ۵۵۳ھ (ویانا میں)

ابن الاثیر کی البسیط نسخہ قاہرہ پر مؤلف کی یادداشت موجود ہے۔

منتخب نزہۃ الالباء، عبد العزیز بن جماعہ کے خط میں، احمد تیمور پاشا کے کتاب خانے کا نسخہ۔

ابن شاکر کی عیون التاریخ کی بارہویں اور بیسویں جلدیں خود مصنف کے خط میں احمد زکی پاشا کے کتاب خانے میں ہیں۔

ابو عبید القاسم بن سلام کی تالیف: کتاب الاموال پر ذیل کا نسخہ بخط مؤلف علی ابن ایوب مقدسی احمد زکی پاشا کے یہاں ہے۔

تاریخ النساء، تالیف یاسین العمری الموصلی خود مؤلف کے خط میں، احمد زکی پاشا کے کتب خانے میں ہے۔

کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ، تالیف ابو منصور موفق ہروی کا واحد نسخہ، فارسی کے مشہور شاعر اسدی طوسی (م: ۴۶۵) کے خط میں ویانا میں ہے، اس کی تاریخ کتابت سنہ ۴۴۷ھ ہے، اور اس لحاظ سے فارسی زبان میں سب سے قدیم مخطوطہ ہے، خط نسخ، ۲ کالم، بہ کوفی میں ہے۔

ترجمان البلاغہ، تصنیف محمد بن عمر الرادویانی نسخہ منحصر بفرد کتب خانہ فاتح استنبول میں موجود ہے، اس کی کتابت سنہ ۵۰۰ھ میں ہوئی، کاتب ابوالہیجاء اردشیر بن دیلمیار القطبی شاعر ہے، جس کے مشورے سے اسدی طوسی نے لغت فرس لکھی تھی، ترجمان البلاغہ مدتوں فرخی سیستانی کی تصنیف سمجھی جاتی رہی ہے،

وفیات الاعیان، تالیف ابن خلکان (۶۸۳) کا نسخہ متحف برطانیہ بخط مولف ہے۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے فضلاء نے قلمی نسخے اپنے ہاتھ سے تیار کیے، مطالعہ کے دوران ان پر یادداشتیں لکھیں، ان سے نہ صرف مخطوطات کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، بلکہ وہ خود ادبی تاریخ کے ماخذ کا کام کرتی ہیں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان مخطوطات کا بیشتر حصہ برباد ہو چکا ہے، ابن ندیم کی روایت پر کہ جو کتابیں دستبرد زمانہ سے بچی ہیں، جو ہزار میں ایک کی نسبت سے ہیں، یہ چوتھی صدی کی بات ہے، اگر اس کو انتہائی مبالغہ پر محمول کیا جائے تو شاید سو اور ایک کی نسبت میں مبالغہ نہ ہو، یہ تو حملۂ تاتار سے پہلے کا حال ہے، اس سانحے سے اسلام کے مشرقی حصے کو جو جانی، مالی، علمی، تہذیبی نقصان پہونچا ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ایک طرف تو لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، تو دوسری طرف سیکڑوں عظیم کتاب خانے نذر آتش ہوئے، اور اس طرح اسلامی علوم کا بڑا سرمایہ ضائع ہو گیا، حملۂ تاتار سے اسلامی تمدن کو جو نقصان پہونچا اس کی تلافی ناممکن ہے، کتابوں کے اس عظیم سرمایے سے قطع نظر اس کے بعد کے ادوار کا علمی معیار بھی پست ہو گیا،

مخطوطات کی بربادی میں سیاسی اسباب کے علاوہ اور دوسرے عوامل کا بھی دخل ہوتا ہے، اور سب سے بڑی بات جہل اور عام آدمیوں کی غفلت ہوتی ہے، وہ اچھی اور بری کتابوں میں تمیز نہیں کر سکتے، یہی وجہ ہے کہ اہم مخطوطات کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو کسی غیر ضروری کتاب کے ساتھ ہو، حال ہی کی

بات ہے کہ لاہور کے مشہور پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، اسی دوران میں اس کی پھٹی جلد کے اندر ان کو کوئی قدیم تحریر نظر آئی، جلد کے اوراق کھولے گئے تو اس سے عنصری کی مفقود مثنوی وامق و عذرا کے خاصے اوراق برآمد ہوئے، پروفیسر صاحب نے ان اوراق کو بڑی توجہ سے پڑھ کر شایع کر دیا، اس طرح ایک گم شدہ کتاب کا پتہ چل گیا۔

ایک عجیب بات ہے کہ مخطوطات کی حفاظت کی ہر چند کوشش کی جائے، مگر وہ زیادہ سود مند نہیں ہوتی، رشید الدین فضل اللہ طبیبؒ غازان خان کا دانشمند وزیر تھا، وہ جامع التواریخ کا مصنف ہے، جو عالمی تاریخ نویسی کی زندہ مثال ہے، فضل اللہ کی اور دوسری تصانیف بھی ہیں، اس نے تبریز میں ایک کالونی آباد کی، اس کا نام ربع رشیدی رکھا، اس کا ایک حصہ کاتبوں اور خطاطوں کے لیے وقف تھا، جو اس کی کتابوں کے نسخے تیار کرنے پر مامور تھے، اس طرح اس کی تصانیف کے سیکڑوں نسخے تیار ہو گئے، اس کے علاوہ اس نے ایک تدبیر یہ بھی کی تھی کہ اپنی ساری کتابوں کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں منتقل کرا دیا تھا، لیکن جس وقت پروفیسر براؤن تاریخ ادبیات ایران لکھ رہے تھے، رشید کی کتاب کا کوئی نسخہ مکشوف نہ تھا، بہرحال اس کے چند سال بعد جامع التواریخ کے نسخے ملے، اور اب یہ کتاب شایع ہو چکی ہے، اس کے مجموعہ رسائل کے نسخے بھی مل چکے ہیں، اور ربع رشیدی کا تیار کیا ہوا ایک نسخہ (عربی زبان والا) راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں بھی موجود ہے، اس کی ایک ضخیم کتاب "اسولہ واجوبہ" ہے، اس کے نسخے بھی مکشوف ہوئے ہیں، ایک نسخہ اٹاوہ میوزیم میں بھی تھا، جو اب مسلم یونیورسٹی میں منتقل ہو چکا ہے۔

باوجود اس امر کے کہ اسلامی علوم کا بیشتر خزانہ ضائع ہو چکا ہے، اور جو باقی ہے وہ محض ایک حقیر چیز ہے، اور اس باقی ماندہ چیز کا بڑا حصہ قلمی شکل میں ہے، اور یہ قلمی کتابیں اس گئی گذری حالت میں بھی اتنی ہیں کہ کسی دوسرے تمدن میں نہ ہوں گی، یہ مخطوطے مشرق اور مغرب کے کتبخانوں میں محفوظ ہیں، مغرب کے بیشتر کتبخانوں کی فہرستیں بھی شایع ہو گئی ہیں، محض یورپ میں قلمی کتابوں کی تعداد لاکھ سے متجاوز ہو جائیگی،

اخبار التراث العربی کے حالیہ شمارے کی ایک اطلاع کے مطابق چالیس ہزار سے زیادہ عربی مخطوطے صرف روس کے مختلف علاقوں میں ہیں، ان میں فارسی اور ترکی کے مخطوطات جو اسلامیات سے تعلق رکھتے ہیں شامل نہیں، اقبالؒ نے یورپ کے کتاب خانوں میں جب اسلامی خزانے دیکھے تو ان کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، اس وقت انھوں نے قطعہ لکھا جس کے یہ شعر قابل ملاحظہ ہیں: ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی — جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن — کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

واقعی اہل یورپ کی کتابوں کے محفوظ کرنے اور پھر ایک حد تک ان کے متعارف کرانے کی سعی مشکور ہوئی، البتہ مشرقی ممالک میں قلمی کتابیں نسبۃً منتشر ہیں، اور ان سے استفادہ آسان نہیں، اکثر کتاب خانوں کی فہرستیں نہیں چھپی ہیں، ذاتی ذخائر کے بارے میں معلومات ہی نہیں، ضرورت ہے کہ ان ذخائر کا پتہ چلایا جائے، اور سب کتاب خانوں کی خواہ عمومی ہوں یا شخصی فہرستیں مرتب ہوں، اس کے بعد صحیح طور پر اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے ذخائر کی کیا نوعیت ہے، اور ہمارے علوم کا کتنا سرمایہ مشرق میں موجود ہے، ادھر چند سالوں سے عرب ممالک میں کچھ ملی احساس بیدار ہوا ہے، اور اپنے علمی ورثہ کی بازیافت اور اس کے متعارف کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔

اسلامی علوم سے متعلق جو قلمی ذخیرے ہیں، وہ اس لحاظ سے نہایت درجہ اہم ہیں کہ اتنے متنوع قسم کے مخطوطات کسی دوسرے معاشرے میں نہیں ملیں گے، اور تعداد کے اعتبار سے وہ ساری تہذیبوں پر فائق ہیں، صرف قرآن کریم کے مخطوطات پر غور کریں تو اسلامی تمدن کی علمی برتری پوری طرح واضح ہو جائیگی، اس صحیفے کے جتنے نسخے دنیا میں ہیں، کسی ایک کتاب کا کیا ذکر، متعدد فنی کتابوں کے سارے مخطوطات اتنے نہ ہوں گے، پھر ان پر جتنی فنکارانہ مشق ہوئی ہے اس کی مثال سارے عالم میں نہیں ملے گی، قرآن مجید کے نسخوں سے خطاطی کی تاریخ مرتب ہو سکے گی۔

اسلامی مخطوطات پر نظر ڈالنے سے ایک لحاظ سے اطمینان ہوتا ہے کہ باوجود اتنے کم ہونے کے دوسری تہذیبوں کے مقابلہ میں آج بھی وہ زیادہ وقیع ہیں، لیکن ساتھ ہی اتنے سرمایے کی بربادی پر بڑا افسوس ہوتا ہے، اور جیسا کہ عرض ہو چکا ہے برباد شدہ حصہ باقی حصے کا کئی گنا ہے، اگر محض عظیم مصنفین کے آثار پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کی تمام تصانیف ہم تک پہونچی ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی علوم سے متعلق ہمارا علم کتنا ناقص و نامکمل ہے، گم شدہ مواد کا ایک نقشہ ہمارے ذہن میں اس طرح قائم ہو سکتا ہے اگر ہم چند کتابوں کے ماخذ و منابع پر ایک نظر ڈال لیں، فی الحال میں تین کتابوں کا مطالعہ اس لحاظ سے پیش کرتا ہوں:

۱۔ فضائل بلخ، تالیف شیخ الاسلام صفی الدین ابو بکر عبد اللہ بن عمر بن محمد بن داؤد واعظ بلخی، تالیف ۶۱۰ھ

۲۔ طبقات الصوفیہ خواجہ عبد اللہ انصاری، تالیف ۴۸۱ھ۔ ۳۔ العباب الذاخر تالیف امام صغانی (م ۶۵۰ھ)

فضائل بلخ ع ربی زبان میں تھی، یہ کتاب مفقود ہے، اس کا فارسی ترجمہ باقی ہے، مترجم عبد اللہ محمد بن محمد ابن حسینی بلخی اور ترجمہ کی تاریخ ۶۷۶ھ ہے، فضائل بلخ میں ستر ایسے مشائخ بلخ کا تذکرہ ہے جن سے حدیث تداولت ہے، ان میں پہلے شیخ رومان بلخی ہیں جو صحابی تھے، فضائل بلخ کے ماخذ میں حسب ذیل کتابیں تھیں:

۱۔ مناقب بلخ، ناپید ہے۔ ابو زید بلخی، ۲۔ تاریخ بلخ محمد بن عقیل بلخی، ناپید ہے، ۳۔ کتاب البہجہ، ناپید ہے، ۴۔ طبقات عبد اللہ جوئے باری، ناپید ہے، ۵۔ المعجم الکبیر ابو اسحاق مستملی، ۱۴ دفتر میں تھی، سمعانی نے کتاب الانساب میں تذکرہ کیا ہے، اب ناپید ہے، ۶۔ طبقات علی بن فضل، چار مجلد میں تھی، اب ناپید ہے، ۷۔ تواریخ بلخ ناپید ہے، ۸۔ تاریخ بلخ ناصر الدین سمرقندی، ناپید ہے، ان کے علاوہ حسب ذیل کتابوں کا نام آیا ہے: ۱۔ سلوۃ العارفین، ناپید ہے، ۲۔ رسالہ قشیریہ، موجود ہے، ۳۔ تذکرۃ الاولیاء موجود ہے، ۴۔ الحدایق لاہل الحقایق، موجود ہے، ۵۔ کتاب ضحاک، ناپید ہے، ۶۔ نزہۃ الملاحظہ، ناپید ہے، ۷۔ کتاب النوازل، موجود ہے، ۸۔ کتاب النوادر، ۹۔ جمل الغرائب، موجود ہے، ۱۰۔ حلیۃ الاولیاء

موجود ہے، ۱۱۔ کتاب العافیہ، ناپید ہے، ۱۲۔ تصانیف ہرثمہ، ناپید ہے، ۱۳۔ امالی شیخ المشائخ، ناپید ہے، ۱۴۔ امالی شیخ الاسلام محمد بن احمد بلخی، ناپید ہے، ۱۵۔ امالی قاضی القضاۃ ابو بکر، ناپید ہے، ۱۶۔ کتاب الدلائل البینات، ناپید۔

مؤلف کے آٹھ اہم منابع میں کوئی موجود نہیں، بقیہ سولہ کتابوں میں سے چھ موجود ہیں، اور ۱۰ مفقود۔

خواجہ عبد اللہ انصاری کی طبقات الصوفیہ کے قبل کے متعدد صوفیہ کے تذکرے لکھے گئے تھے، ان میں سے سوائے سلمی (م: ۴۱۲) کے طبقات کے کوئی باقی نہیں ہے، خواجہ صاحب نے حسب ذیل ماخذ سے اپنا تذکرہ تیار کیا تھا:

۱۔ تاریخ مشائخ یا طبقات الصوفیہ، تالیف محمد بن علی حکیم ترمذی، ان کی وفات ۲۵۵ھ میں ہوئی، ابو الحسن علی ہجویری صاحب کشف المحجوب نے یہ کتاب دیکھی تھی، یہ کتاب مفقود ہے۔

۲۔ اخبار الصوفیہ والزہاد، تالیف ابو بکر محمد بن داؤد بن سلیمان، متوفی ۳۴۲ھ سلمی کے استاد تھے، یہ کتاب بھی مفقود ہے۔

۳۔ طبقات النساک، تالیف ابو سعید احمد بن محمد غزنی، متوفی ۳۴۱ھ، ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں اس سے استفادہ کیا ہے، اب ناپید ہے۔

۴۔ کتاب اسمار مشائخ فارس، تالیف ابو عبد اللہ محمد بن خفیف، متوفی ۳۷۱ھ یا ۳۳۱ھ یہ کتاب اب موجود نہیں۔

۵۔ کتاب اللمع، تالیف محمد بن احمد بن ابراہیم معروف بہ ابو بکر مفید، ابو نصر سراج نے اپنی تصنیف اللمع میں اس سے استفادہ کیا ہے،

۶۔ معجم الشیوخ، تالیف ابو اسحاق ابراہیم بن احمد بن داؤد مستملی بلخی، متوفی ۳۷۶ھ، اسی

مصنف کی ایک دوسری کتاب طبقات اہل بلخ بھی جو ابن حجر عسقلانی کے مطالعہ میں تھی، ہمیں اس کے کسی نسخے کا علم نہیں۔

۷۔ طبقات الصوفیہ، تالیف ابو العباس احمد بن محمد بن زکریا زاہد نسوی (م ۳۹۶ھ)

۸۔ تاریخ ابوبکر محمد بن عبداللہ رازی شیخ خراسان استاد سلمی (م ۴۰۰ھ)

۹۔ طبقات الصوفیہ، تالیف ابو عبدالرحمن محمد بن حسین سلمی (م ۴۱۲ھ)

یہی آخرالذکر کتاب[1] باقی ہے، بقیہ کسی ایک کا پتہ نہیں۔

امام حسن بن محمد بن حسن صغانی لاہوری (م: ۶۵۰) مشارق الانوار کے لائق مصنف ہیں، ان کی کتاب العباب الزاخر لغت کی مشہور کتاب ہے، اس کے مقدمہ میں سو سے زیادہ کتابوں کا ذکر ہے، ان میں سے نصف کے قریب فنا ہو چکی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

محمد بن حبیب بغدادی کی حسب ذیل کتابیں: کتاب المنمق، موشح، موتلف، المؤتلف والمختلف، کتاب ایام العرب، ابوحاتم سجستانی کی حسب ذیل کتابیں: کتاب الطیر، کتاب النخلہ، ابن الصائب کلبی کی کتاب المعمرین، کتاب الافتراق العرب، کتاب القاب الشعراء، ابن السکیت: کتاب الصغیر، کتاب البحث، کتاب الفرق، اخفش: کتاب النوادر، کسائی: کتاب النوادر وغیرہ وغیرہ۔

تفصیلات بالا سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے اثاثے کا کتنا بڑا حصہ مفقود ہے، اس میں کلام نہیں کہ ان مفقود مخطوطات میں کچھ ایسے ضرور ہیں جو گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے ہیں، تحقیق و تلاش سے ان میں سے کچھ ضرور معلوم ہو سکتے ہیں، اور خوشی کی بات ہے کہ اب ایک نہضت شروع ہو چکی ہے، اس کے نتیجے میں کئی ہزار نئے مخطوطات سامنے آ گئے ہیں، خصوصاً عربوں میں اپنے ورثہ کی بازیافت اور ان کو عام کرنے کا شدید جذبہ

[1] یہ عربی کتاب پروفیسر Johanes Pedereni دانش گاہ کوپن ہیگن کے اہتمام سے لیڈن سے دوبارہ ۱۹۶۰ء میں چھپی، پہلی مرتبہ ۱۹۵۳ء میں مصر سے تصحیح ہو کر طبع ہو چکی تھی۔

پیدا ہو چلا ہے، اس کے نتیجہ میں شام، عراق، لبنان، مصر، سعودی عرب، کویت، یمن وغیرہ ممالک میں تحقیقی ادارے کھلتے جا رہے ہیں، اور ان اداروں کے توسط سے نئے نئے مخطوطات سامنے آ رہے ہیں، ان کو متعارف کیا جا رہا ہے، کتاب خانوں کی فہرستیں شایع ہو رہی ہیں، اور دنیا کے مختلف حصوں میں جو اسلامی علوم سے متعلق ہیں، ان سے رابطے قائم ہو رہے ہیں، ان ہی میں کویت کا ادارہ معہد المخطوطات العربیۃ ہے، اس سے ایک نہایت عمدہ علمی و تحقیقی مجلہ اخبار التراث العربی کے نام سے شایع ہو رہا ہے، اس میں نئے نئے مخطوطات اور نادر کتابوں کی اشاعت، کتاب خانوں کی فہرستوں کے بارے میں دلچسپ اطلاعات درج ہوتی ہیں، اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس مجلہ کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے اس نہضت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا جو عالم عرب میں خصوصاً اور دنیائے اسلام میں عموماً شروع ہو چکی ہے، یہ بڑی نیک فال ہے، اور اس سے واضح ہے کہ عالم اسلام کو اپنے ماضی کی شاندار علمی روایات کا احساس بخوبی ہو چکا ہے، اور امید کی جا سکتی ہے کہ ان شاء اللہ چند سالوں میں اسلام کی علمی روایت کی عظمت کا احساس عام ہو جائے گا، اور احساس زیاں سے جو نقصان پہونچا ہے اس کی تلافی ہو سکے گی، اس سلسلہ میں دو تین باتیں ضروری ہیں، اول یہ کہ دوسرے ممالک میں بھی اسی نوعیت سے کام کی رفتار تیز کر دینی چاہیے، دوسرے یہ کہ ان تمام ممالک کے درمیان ایک علمی رابطہ قائم کرنا چاہیے، اس کے لیے ایک عالمی ادارے کے قیام کی ضرورت ہے، تیسری گذارش یہ ہے کہ دراصل عرب علوم اسلامی کو عربی ورثہ کہتے ہیں، یہ نام صحیح نہیں، اس کو اسلامی ورثہ کہنا چاہیے اس لیے کہ ان علوم کا تعلق نہ صرف عرب ممالک اور عربی زبان سے ہے، بلکہ غیر عرب ممالک خصوصاً ایران، ترکی، ہندوستان، پاکستان وغیرہ مشرقی ممالک کا اسلامی علوم کی ترقی میں برابر کا حصہ ہے، اور اسی اعتبار سے عربی کے علاوہ فارسی، ترکی، اردو کا مطالعہ اس سلسلہ میں ناگزیر ہے، بلکہ میں تو یہاں تک عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ملایا اور انڈونیشیا کو بھی اسی زمرے میں شامل کرنا چاہیے، اس نہضت جہانی کی ابتدا ہو چکی ہے، اس میں ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کی از بس ضرورت ہے۔

میری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی علوم نے تہذیب عالم کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے، لیکن ان علوم کا بیشتر حصہ مدفون ہے، اور جو معلوم ہے، وہ گم شدہ حصے کا محض ایک قلیل جزء ہے، اور اس آخرالذکر کا بڑا حصہ مخطوطات کی شکل میں جن کی کثرت کا عالم یہ ہے کہ بعض بعض ممالک میں ان کی تعداد لاکھوں تک پہونچ جائے گی، مخطوطات میں بیشتر ایسے ہیں جہاں تک عوام کا کیا ذکر، فضلاء تک کی رسائی نہیں، ہمارا علم صرف مطبوعات تک محدود ہے، اور یہ مطبوعات کا حصۂ کثیر انتقاد متن کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا، اس سلسلہ میں حسب ذیل امور از بس ضروری ہیں:

۱. اسلامی مخطوطات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اطلاعات بہم پہونچائی جائیں۔

۲. اہم مخطوطات کو چھاپ کر عام کیا جائے۔

۳. چھپی ہوئی کتابوں کو انتقاد متن کے اصول پر پھر سے چھاپا جائے۔

۴. گم شدہ مخطوطات کی بازیافت کی کوشش کی جائے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلہ کی نہضت کا آغاز ہو چکا ہے، اور اہل عرب خصوصیت سے اس طرف متوجہ ہیں، ان میں اپنے ورثہ کی بازیافت کا جذبہ شدت سے پیدا ہو گیا ہے، یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ مستقبل قریب میں اچھے نتائج کے سامنے آنے کی پوری توقع ہے۔۔

اسلام اور عربی تمدن

یہ کتاب شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا ترجمہ ہے، جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن پر علمائے مغرب کے اہم اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی علمی و تمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی آگیا ہے، از شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، قیمت ۲۳ روپئے

مولانا سید سلیمان ندویؒ

نذرانۂ عقیدت

از

عالی جناب سید مظفر حسین برنی صاحب گورنر ہریانہ

"یہ افتتاحیہ خطبہ ہے جو انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ سالگرہ کے ایک سیمینار میں ۹ مارچ ۱۹۸۵ء کو انجمن کے دفتر اردو گھر، راؤز ایوینیو نئی دہلی میں عالی جناب گورنر صاحب نے پڑھا۔ (ص۔ ع)

سب سے پہلے مجھے انجمن ترقی اردو (ہند) کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، کہ اس نے دہلی میں علامہ سید سلیمان ندویؒ مرحوم کی صد سالہ تقریبات ولادت منانے کا اہتمام کیا، انجمن پر سید صاحب کا حق بھی تھا، اس لیے کہ وہ ماضی میں اس تہذیبی اور علمی ادارے کے بڑے قدردان رہے، اور ان کے نامور استاد علامہ شبلی نعمانی مرحوم اسی انجمن کے پہلے سکریٹری تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ مرحوم نے اردو زبان ہی نہیں، تمام مشرقی علوم پر جو احسان عظیم کیا ہے، اس کا اعتراف نہ کرنا بڑی ہی احسان فراموشی ہوتی۔

میرے لیے یہ واقعی عزت و افتخار کی بات ہے کہ ایسی جلیل القدر علمی شخصیت سے منسوب ان تقریبات کا افتتاح کروں، اگرچہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے علمی مراتب کے سامنے خود کو بالکل ہیچ پاتا ہوں، لیکن یہ سوچ کر راضی ہو گیا کہ مجھے تو علم و فضل کا دعویٰ بھی نہیں ہے، جن کو بجا طور پر بھی یہ دعویٰ ہو سکتا ہے وہ بھی مولانا سید سلیمان ندوی

کی قد آور علمی شخصیت کے سامنے بونے ہی نظر آئیں گے، کچھ اسی طرح کا جواز پیدا کر کے میں نے ہامی بھر لی تھی، اور ایک ہوک یہ خوشی بھی تھی کہ اس بہانے تھوڑا سا وقت ایک علمی مجلس میں اہل علم کے ساتھ گذرے گا، اور میں ایسے لمحوں کو اپنی تمام مشغولیتوں میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں،

اردو زبان کی علمی روایات کا تسلسل پورے مشرق سے جڑا ہوا ہے، عربی میں علمی تحقیق کی ڈیڑھ ہزار سال پر پھیلی ہوئی شاندار تاریخ ہے، تو فارسی میں شعر و ادب کا ایسا گنج گراں مایہ موجود ہے جس میں فردوسی، حافظ، سعدی اور رومی جیسے کتنے ہی عِلم و ادب چراغ جگمگا رہے ہیں، یہ ساری تکوینی اور تحقیقی روایات، تہذیب و معاشرت کی چھلنی میں چھن چھن کر اردو زبان کے دامن تک پہونچی ہیں، اس لیے خواہ اردو کی عمر ڈیڑھ دو سو سال سے زیادہ نہ ہو، مگر اس کی علمی و تہذیبی روایات دو ہزار برسوں پر پھیلی ہوئی ہیں، اسی لیے ان میں تب و تاب ہے، اور یہی سبب ہے کہ عہد زوال میں بھی یہ زبان اپنی نشو و نما سے محروم نہیں رہی ہے، انیسویں صدی کے نصف آخر سے مغربی افکار نے بھی ان علمی روایات میں نئی جلا اور تازگی پیدا کی ہے۔ اس لیے اردو کی کوئی علمی شخصیت جسے مشرقی علوم یعنی عربی و فارسی کے علمی خزانوں سے استفادہ کا موقع ملا ہو، اور جس نے جدید مغربی افکار سے بھی کسی حد تک فیض حاصل کیا ہو، اس میں ایک خاص جامعیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے، اس کا علم وسیع بھی ہوگا، گہرا بھی، فکر انگیز و روح پرور بھی ہوگا، اور بوقلموں و شاداب بھی۔

اس علمی جامعیت کا سب سے شاندار مظہر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت ہے، ان کے کمالات کا ایک مختصر تقریر میں تو کیا، ضخیم کتابوں میں بھی احاطہ نہیں کیا جا سکتا، وہ عالم بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، صاحب طرز انشا پرداز بھی، مورخ بھی ہیں، جغرافیہ دان بھی، لسانیات کے رمز آشنا بھی ہیں، عمرانیات کے دقیقہ رس بھی، وہ نقاد ہیں، محقق ہیں، مبصر ہیں، صحافی ہیں اور صوفی بھی، علوم اسلامیہ میں ان کے درک و بصیرت کا اعتراف علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کیا تھا:

"آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں،

مصنف ہی نہیں، رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے، جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں۔"

ان کے بارے میں ڈاکٹر اقبال کا یہ ریمارک بھی ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا ہے کہ "علوم اسلامی کے جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے؟" علوم اسلامی کے بہت سے باکمال عالم اور محقق گذشتہ صدیوں میں پیدا ہوئے ہیں، جنھوں نے اپنی بیش بہا علمی کاوشوں سے اردو زبان کے خزانے کو شاندار اور بھر پور بنایا ہے، مگر آپ موازنہ کریں گے تو یہ پائیں گے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی شان ہی کچھ اور ہے، وہ کسی میدان میں بند نہیں ہیں، اور جدھر نکل جاتے ہیں اپنے نقش پا چھوڑ جاتے ہیں ایسے نقشِ پا کہ ع

سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد شد

علوم قرآنیہ، تفسیر، حدیث، سیرت، فن رجال، تاریخ اسلام، تاریخ افکار اسلامی، منطق و فلسفہ، علم الکلام، علم لغت، غرض ماضی کے شاندار تہذیبی ورثہ کا کوئی ایسا اہم پہلو نہ رہا ہوگا، جس میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی بصیرت اور گہری فراست کا ثبوت نہ دیا ہو، اس کا اندازہ اس بات سے ہو جائے گا کہ اپنے خطوط میں علامہ اقبال جن کو مشرقی اور مغربی علوم دونوں پر عبور حاصل تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے مختلف علمی اور ادبی امور میں بہت ہی عجز و انکسار کے ساتھ معلومات حاصل کرتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ مولانا کے جوابات اب تک منظر عام پر نہ آسکے، ورنہ علم و ادب کا ایک چمنستان کھل جاتا۔

ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے، انھوں نے ۱۹۱۶ء میں "ارض القرآن" جیسی محققانہ کتاب دو جلدوں میں لکھی، جس میں اُن مقامات اور اقوام و قبائل کی تاریخی و اثری تحقیق ہے، جن کا حوالہ قرآن مجید میں آیا ہے، لینڈ آف دی بائبل پر ایسے کئی کام ہو چکے ہیں، اور زیادہ تر اُن لوگوں نے کیے ہیں جن کا تعلق ارض شام و فلسطین کی حفری مہموں (EXCAVATIONS) سے رہا ہے، لیکن ان کی

تحقیقات میں برابر رد و بدل ہوتی رہی ہے۔ اور آج سے ۲۰ ـ ۲۵ سال قبل مصر میں جو ذخیرہ Papyri کا دریافت ہوا اس نے تو بیشتر محققوں کو اپنی کتابوں پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کردیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے EXCAVATIONS کی عملی مہموں میں حصہ نہیں لیا، مگر جغرافیۂ قرآنی کے سلسلہ میں جن نتائج تک وہ ۱۹۱۶ء میں پہونچ گئے تھے، ان میں نہ کوئی اہم اضافہ ہوسکا ہے، نہ کسی تحقیق کو مکمل طور پر رد کیا جاسکا ہے،

ان کا دوسرا اور سب سے اہم کارنامہ جو انھیں ہمارے علماء کی صف میں ہمیشہ ممتاز و منفرد رکھے گا وہ سیرۃ النبیؐ ہے، اردو زبان میں ایک جامع اور مکمل کتاب سیرت لکھنے کا پلان علامہ شبلی مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں بنایا تھا، اور اس کی سرپرستی، ریاست بھوپال کی علم دوست فرماں روا نواب سلطان جہاں بیگم نے کی تھی، شبلیؒ نے بڑی لگن اور عقیدت کے ساتھ اسی کام کو شروع کیا تھا، اور کہا تھا ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

انھوں نے تمام معروف و غیر معروف مستند ماخذوں سے سیرت طیبہ کا مواد اکٹھا کرنا شروع کیا، پہلی جلد مرتب ہوچکی تھی، دوسری جلد ابھی پوری طرح مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ علامہ شبلیؒ کو سفر آخرت کا بلاوا آگیا، انھیں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا بہت خیال تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ اس وقت دکن کالج پونا میں لکچرر تھے، علامہ شبلیؒ نے انھیں بلایا، اور وصیت کی کہ جس طرح بھی ہو اس منصوبے کو مکمل کردیں، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے استاد کے حکم کی تعمیل کی، اور کالج کی ملازمت ترک کرکے سیرۃ النبیؐ لکھنے میں مشغول ہوگئے، پھر انھوں نے جس شان سے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا، وہ آپ سب جانتے ہیں، دنیا کی کسی زبان میں ایسی جامع اور منفرد کتاب سیرت کے موضوع پر موجود نہیں ہے، صرف یہی ایک کارنامہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی حیات جاوداں کی ضمانت بن سکتا تھا، مگر ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر کتاب کا یہی حال ہے کہ وہ ان کے فضل و کمال اور بے مثال صلاحیتوں پر گواہ بن گئی ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی پانچ جلدوں میں انھوں نے جس طرح سیرت اور فلسفۂ سیرت کو پیش کیا ہے، اسے پڑھ کر یہ تاثر ہوتا ہے کہ اب اس موضوع پر لکھنے کی گنجائش نہیں رہی ہے، مگر اس خیال کی تردید بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ ہی کرسکتے تھے، انھوں نے اکتوبر، نومبر ۱۹۲۵ء میں سیرت ہی کے موضوع پر آٹھ لکچر دیے، جو خطبات مدراس کے نام سے چھپے ہیں، ان میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور مغربی فکر سے متاثر مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے، اس لیے تمام انداز وہی ہے جو ایک مغرب زدہ ذہن کو اپیل کرسکتا ہے، یہ خطبات انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہوکر بھی مقبول ہوئے ہیں، اور عربی ترجمہ پڑھ کر عرب علماء نے بھی اعتراف کیا ہے کہ اس انداز کی کوئی کتاب سیرت طیبہ کے موضوع پر عربی زبان میں بھی موجود نہیں ہے۔

سیرت کے علاوہ وہ سوانح نگاری کے میدان کے بھی شہسوار ہیں، "حیات مالکؒ" (۱۹۱۷ء)، "سیرت عائشہؓ" (۱۹۲۴ء) اور "حیات شبلی" (۱۹۴۴ء) انھیں اردو کا بہترین سوانح نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر مارچ ۱۹۲۹ء میں "عرب و ہند کے تعلقات" پر جو لکچر دیے تھے، وہ آج تک اس موضوع پر سب سے زیادہ مفصل عالمانہ اور محققانہ خطبات ہیں، مارچ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایما پر "عربوں کی جہاز رانی" پر چار لکچر بمبئی میں دیے، جن سے اس موضوع پر بہت سی نئی باتیں پہلی بار سامنے آئیں۔

عربی زبان پر ان کی قدرت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں طلبہ کی رہنمائی کے لیے جدید عربی کی ایک لغت چند ماہ میں تیار کرلی تھی، جس میں اخبارات و جرائد میں استعمال ہونے والی زبان کا اندراج کیا گیا ہے، اور برسوں تک اردو میں یہ واحد لغت رہی، جس سے جدید عربی کے الفاظ کو سمجھا جاسکتا تھا، فارسی میں ان کی گہری واقفیت کا حال "خیام" سے معلوم ہوتا ہے، خیام پر مشرق و مغرب میں بہت کام ہوا ہے، مگر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی علمی تحقیقات سب سے ممتاز ہیں، اقبالؔ نے یہ کتاب دیکھ کر کہا تھا کہ اب

اس موضوع پر برسوں تک کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکے گا، یہ کتاب ۱۹۳۳ء میں چھپی تھی، آدھی صدی سے زیادہ عرصہ تو گذر گیا ہے اور کوئی اسکالر نہ ایران میں، نہ ہندوستان میں، اس پر ایک سطر کا اضافہ نہیں کر سکا ہے، البتہ انگلستان میں ایک مشہور جدید شاعر Robert Greves نے رباعیات کے ایک قدیم نسخہ پر کچھ تحقیق کی ہے جو ایک ایرانی امیر کے قبضہ میں تھا، لیکن اس کا درجہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف کے مقابلہ میں درخور اعتنا نہیں۔

یہ ان کی چند تصانیف کے نام ہیں، ان کے علاوہ اردو زبان اور لغت سے متعلق مسائل پر ان کے مضامین "نقوش سلیمانی" اپنی جداگانہ شان رکھتے ہیں، وہ لسانیات کے مرد میدان نہیں تھے، اور یہ ایک جدید ترین شاخ ہے، جس میں اب تو سائنسی آلات اور کمپیوٹر کی مدد سے ریسرچ ہو رہی ہے، سید صاحبؒ نے لسانیات اور علم اللغۃ (فیلالوجی) میں بھی جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے زمانہ کے وسائل کو دیکھتے ہوئے حد درجہ قابل تعریف کوشش ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے جولائی ۱۹۱۶ء سے رسالہ "معارف" شایع کیا، اور چالیس سال تک اس کے ایڈیٹر رہے، اس میں شذرات کے علاوہ وہ "یاد رفتگان" کا بھی ایک کالم لکھتے تھے، "باب الانتقاد" میں سیکڑوں کتابوں پر عالمانہ تبصرے کیے، اور "معارف" کا ایسا بلند علمی معیار قائم کر دیا کہ اردو کا کوئی دوسرا مجلہ اس کی رفعت کو نہیں پہونچ سکا، "معارف" میں جو علمی مضامین شایع ہوتے رہے ہیں، ان کی وجہ سے اس رسالہ کے فائل اب علوم مشرقی کی ایک بھرپور انسائیکلوپیڈیا نظر آتے ہیں، اگر انھی مضامین کو معمولی قطع و برید کے بعد ابجدی ترتیب میں شایع کر دیا جائے تو نہایت اعلیٰ پایہ کی انسائیکلوپیڈیا بنی بنائی موجود ملے گی۔

موضوع بہت وسیع ہے اور مجھے اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہے، پھر بھی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت، سیرت اور علمی کارناموں کے اتنے وسیع اور رنگا رنگ پہلو نگاہوں کے سامنے آتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہے، کیا کہا جائے، کیا دکھا جائے ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

سید صاحبؒ انشاء پرداز بھی ایسے تھے کہ سیرۃ النبیؐ میں انھوں نے اپنا اسلوب علامہ شبلی نعمانیؒ کے اسلوب سے ملا دیا ہے، اور آج یہ تمیز کرنا دشوار ہے کہ علامہ شبلیؒ کا قلم کہاں ہے، اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کہاں بول رہے ہیں، اسی طرح انھوں نے جب مولانا آزاد کے اخبار "الہلال" میں علمی و سیاسی موضوعات پر مضامین لکھے تو ایک دھوم مچ گئی، "الہلال" میں مضمون نگار کا نام نہیں ہوتا تھا، اس لیے ساری تحریریں مولانا آزاد ہی کی سمجھ لی گئیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ جن بعض مضامین نے اپنے زمانہ میں بے حد مقبولیت حاصل کی، اور مولانا آزاد کی تحریر سمجھ کر انھیں "مقالات آزاد" کے مجموعوں میں شامل کر لیا گیا، وہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے نکلے گئے تھے، ان میں "اسلام اور سوشلزم" (البلاغ، فروری ۱۹۱۱ء) "الحریۃ فی الاسلام" (الہلال، جون ۱۹۱۳ء تا اکتوبر ۱۹۱۳ء) "مشہد اکبر" (الہلال، اگست ۱۹۱۳ء) کا بطور مثال ذکر کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کو شعر و سخن سے باضابطہ تعلق تو نہیں رہا، البتہ طبیعت موزون پائی تھی، مثال کے طور پر سفر گجرات کے دوران جب بھروچ پہونچے اور دریائے نربدا کے کنارے کھڑے ہوئے تو جذبات کے تلاطم نے ایک خوبصورت نظم کی شکل اختیار کر لی، چند اشعار ملاحظہ ہوں[1]؎

نربدا! اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب — گرچہ تو ہندی ہے، لیکن زادۂ بحر عرب
تو گذشتہ کاروانوں کا نشان راہ ہے — ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار — تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اس کی یادگار
تو ہے دریائی پری، یا شاہد عالم ہے تو — اس سمندر کے گلے کی شہ رگ اعظم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک سرشار جام — اس تن آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام

مولانا کا مجموعۂ کلام "ارمغان سلیمان" کے نام سے کراچی میں چھپ چکا ہے۔

---

[1] نقوش سلیمانی، ص ۲۷۲

یہاں[1] یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا شروع شروع میں عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔

اسی طرح جب جگر مرادآبادی کا کلام پہلی بار سنتے ہیں تو اس کی سرمستی اور سرشاری سے اسی درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ کلام جگر کے مجموعہ "شعلۂ طور" پر ایک بے مثال تعارف لکھتے ہیں، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو

"جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے، اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک، اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو، اور خم خانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہوکر بزم ساقیٔ کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے، جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھیں پرخمار، مگر اس کا دل ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو۔"

کیا طرز ادا ہے، کیا ندرت بیان ہے، کیا روانی ہے اور کیا حسین تجزیۂ کلام جگر ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ ندوۃ العلماء سے بھی وابستہ رہے، اور اس کے مجلہ "الندوۃ" کی ادارت کئی بار انھیں سونپی گئی، وہاں وہ تفسیر، فقہ اور حدیث کا درس بھی دیتے رہے، پھر انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڈھ کو ایک بے مثال علمی ادارہ بنانے میں اپنی زندگی کا بہترین حصہ وقف کر دیا، آج بھی ندوۃ العلماء یا دارالمصنفین کا جو علمی وقار ہے، اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بے لوث خدمات کا بہت بڑا حصہ ہے، انھیں شاگردوں اور مخلص رفیقوں کی بھی ایک ایسی جماعت مل گئی کہ ان حضرات نے دنیا کے طمطراق سے آنکھیں بند کر کے قلندرانہ وضع میں ساری زندگی گذار دی اور علم کی خدمت کر کے مگن رہے۔

انھوں نے قابل رشک وقار و تمکنت کے ساتھ پوری زندگی صرف کتابوں اور کتب خانوں کے درمیان گذاری، اور اب وہ ہمیشہ ان کتب خانوں میں زندہ رہیں گے اور ان کی کتابوں کی ایک ایک سطر ان کے علم و فضل اور پاکیزہ مذاق کی گواہی دیتی رہے گی۔

---

[1] نقوش سلیمانی، ص ۴۶۳۔

٭٭٭

ہم مولانا محمد علی جوہرؔ سے کیا سیکھ سکتے ہیں؟

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"یہ مقالہ کلکتہ کی مولانا محمد علی لائبریری کے اس سمینار میں پڑھا گیا جو مولانا محمد علی جوہرؔ پر ۱۷، ۱۸ فروری ۱۹۸۵ء کو کلکتہ میں ہوا"

مولانا محمد علی جوہر پر یہ سمینار اس وقت ہو رہا ہے جب ہمارا ملک بقول ہمارے وزیر اعظم راجیو گاندھی اکیسویں صدی میں داخل ہونے والا ہے، گذشتہ دسمبر میں ہمارے ملک میں جو انتخاب ہوا، اور اس میں اندرا کانگریس کو غیر معمولی فتح و کامرانی ہوئی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریمتی اندرا گاندھی کی المناک وفات کے بعد ہمارا ملک از سر نو تازہ دم ہوکر جاگ اٹھا ہے، اس جاگ کے بعد یہ سوچنا ہے کہ اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کو اپنی سیاسی زندگی کو کس طرح سنوار کر کے رکھنا ہے، اس سنوارنے میں کیا مولانا محمد علی جوہر کی زندگی مدد دے سکتی ہے؟ کیا ان کی سیاسی زندگی سے ہم کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں؟ کیا وہ ہمارے لیے کوئی پیام چھوڑ گئے ہیں؟

جہاں تک میری ذاتی رائے ہے کہ میں ان کو مسلمانوں کا ایک ایسا قائد سمجھتا ہوں جن سے بہتر ان سے پہلے کوئی پیدا نہیں ہوا، آپ کو حق ہے کہ آپ اس رائے سے اختلاف کریں، لیکن آپ کو اس کا حق نہیں کہ مجھ کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کریں، یہ تسلیم کہ ان کی سیاسی زندگی شکستوں سے معمور رہی، انھوں نے کامریڈ اخبار

نکالا جس کی صحافت نگاری کو انگریزوں نے بھی تسلیم کیا، لیکن یہ وہ بہت دنوں نہ نکال سکے، انھوں نے اردو
میں بھی ہمدرد اخبار نکالا، لیکن یہ بھی بہت دنوں تک جاری نہیں رہ سکا، وہ خلافت تحریک کے علمبردار رہے،
لیکن ترکی میں خلافت کو قائم نہ کرا سکے، حجاز میں جب شاہ سعود کا تسلط ہوا، تو ان کی کوشش تھی کہ وہاں شرعی جمہوریت
قائم ہو، لیکن یہ بھی نہ کرا سکے، وہ شاردا ایکٹ کے خلاف لڑے، لیکن اس کو بھی منسوخ نہ کرا سکے، وہ گاندھی جی سے
مل کر ہندو مسلمان اتحاد قائم کر کے ہندوستان کو جنت نشان بنانا چاہتے تھے، لیکن نہ بنا سکے، وہ غلام ہندوستان
کی آزادی کی جنگ میں شریک ہوئے، لیکن اپنی زندگی میں ہندوستان کو آزاد نہ دیکھ سکے، وہ زندگی بھر دوسروں
سے لڑتے ہی رہے، کبھی انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج، کبھی ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ، کبھی حجاز کے
ابن سعود، کبھی ترکی کے مصطفٰے کمال، کبھی گاندھی جی، کبھی موتی لال نہرو، کبھی اپنے مرشد مولانا عبد الباری فرنگی محلی،
کبھی پنڈت مدن موہن مالوی، کبھی کسی عالم، کبھی کسی ایڈیٹر، کبھی اپنے مخلص ترین دوست، کبھی اپنے بڑے بھائی مولانا
شوکت علی سے لڑے، کبھی ان پر یہ الزام آیا کہ خلافت تحریک کے فنڈ کو بے دردی سے خرچ کیا، اور جب وہ اپنی زندگی
کے آخری ایام میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے لندن جا رہے تھے، تو لکھنؤ کے اخبار پائنیر نے ان پر ایک
مضمون لکھا، جس میں ان کے نام کے ساتھ یہ سرخی لکھی کہ

"A brilliant man without any achievement"

ہاں! یہ ضرور ہے کہ ان کی زندگی شکستوں، نامرادیوں اور ناکامیوں سے معمور رہی، لیکن یہ کیا بات ہے کہ
جب ان کی وفات ہوئی تو اس زمانہ کے ہندوستان کے سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر بین نے کہا کہ محمد علی ایک عظیم مسلمان،
ایک عظیم محب وطن اور انسانیت کا ایک عظیم پیامبر تھا، انگریزی زبان کے مشہور مصنف ایچ۔ جی۔ ولیس نے
کہا کہ محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا، ان کی زبان برک کی زبان تھی، اور ان کا قلم میکالے کا قلم تھا، ان کی میت
لندن سے بیت المقدس لے جائی گئی، جب یہ پورٹ سعید پہونچی تو مصر کے وزیر اعظم اور مشائخ جنازہ کی پیشوائی
کے لیے آئے، اس کو لے جا کر مسجد عباس میں نماز جنازہ پڑھی، مصری پولیس نے سلامی دی، شہزادہ محمد علی نے

غلاف کعبہ کا ایک ٹکڑا تابوت پر رکھا، اور جب یہ میت یروشلم پہونچی تو اس کے آگے آگے فلسطین کے مفتی اعظم تھے،
اور ان کے پیچھے دو لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں کا سوگوار مجمع تھا، قاہرہ، عمان، ٹیونس وغیرہ سے آئے ہوئے
لوگوں نے پُر درد مرثیے پڑھے، مختلف حکومتوں کے نمایندوں نے آخری خراج عقیدت پیش کیا، مسجد اقصیٰ میں
جنازہ کی آخری نماز ادا کی گئی، علامہ محمد اقبالؒ نے ان پر ایک نظم لکھی جس کا آخری شعر یہ تھا ؎

خاکِ قدس اورا بہ آغوشِ تمنا گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کی وفات پر لکھا کہ امت محمدیہ کے سوگوار، ہندوستان کے ماتم دار، طرابلس کے
سوگوار، عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار، یونان و انگورہ کے مرثیہ خوان، حجاز کے سوختہ غم، اور بیت المقدس
کے لیے وقف الم کے لیے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ گیا، اور وہ اس میں سما گیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ
نے ان کی وفات سے متاثر ہو کر یہ بھی لکھا کہ افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان،
اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی،
وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہو جاتا تھا اور ان کو بے تاب کرتا تھا، دریغا کہ
قیامت تک کے لیے ساکن ہو گیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں،
حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے
اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی
معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر
لے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے ان کا ماتم ایک نظم لکھ کر کیا، جس کے دو تین اشعار یہ ہیں:

بہ دینِ مصطفٰے دیوانہ بودی
فدائے ملت جانانہ بودی

بہ دل بودی فقیر بے نوائے
بہ قلب پیکر شاہانہ بودی

سیاست را نقاب چہرہ کردی　　دگرنہ عاشق مستانہ بودی

مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر جناب رشید احمد صدیقی نے ان پر ایک مضمون لکھتے ہوئے تحریر کیا:

"محمد علی کے باب میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے، لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے، یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے، مرد غازی کے کارنامے کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہما ہمی و طرب انگیزی، تمغہ و سلطنت کی جگمگ اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح، دمکتے ہوئے چہرے اور ڈوبتے ہوئے سورج کے وقت اس نے جنگ کیسے کی؟"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

"کس بلا کے بولنے والے اور لکھنے والے تھے کہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ ابوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کمپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں، یا پھر شاہجہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے، ملک و ملت کی جنگ اب بھی جاری ہے، لیکن نعرۂ جنگ خاموش ہے، فتح و شکست تو اس کے لیے بنائی گئی ہیں کہ فتح و شکست تو ہوتی رہتی ہیں، لیکن جنگ جو کہاں ہے، شہادت کس کو نصیب ہوگی، ایسا حسین کہاں جس کو خود یزید کی تلاش ہے۔"

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح ہوا، اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کیا تھے، ان کی قیادت کی کیا شان تھی، اور وہ کیا چاہتے تھے، وہ اپنی زندگی میں کہہ گئے تھے ؎

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر　　مر کے جوہر آپ کے جوہر کھلے

وہ جوہر کیا تھے، اس کا اس طرح تجزیہ کرنے میں تامل نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو عرصۂ دراز کے بعد سپہ سالار ملا تھا جو سیاست کے میدان میں خالد بن ولید رضؓ کی طرح جری اور بہادر بن کر اترا، اور اپنی قیادت میں صدیقیت پیدا کی، فاروقیت بھی، حیدریت بھی اور ابوذر غفاریت بھی، ان کی سیاست مسلمانوں کی سیاست کی

بانگِ درا تھی، وہ مسلمانوں کے لیڈر، ہمت مردانہ، مرد قلندر کے انداز ملوکانہ کے ساتھ بنے، بے باکی اور سرفروشی کے ساتھ مسلمانوں کو للکارا، دینِ مصطفےٰ کی دیوانگی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے سینہ سپر ہو کر جرأت، ہمت، پامردی اور بلند حوصلگی کے ساتھ ہر محاذ پر لڑے، اسی لیے ان پر وطنی محبت کا کیف، نشہ اور خمار بھی چھایا رہا، یہی محمد علی جوہر کا اصلی جوہر تھا۔

جس معیار سے بھی ان کو پرکھا جائے وہ وطن دوست کی حیثیت سے کسی بھی ہندوستان کے عظیم ترین رہنما سے کم نظر نہیں آئیں گے، انھوں نے اپنے بھائی مولانا شوکت علیؒ سے مل کر برطانوی حکومت کے خلاف جو بیزاری، بلکہ نفرت مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی، وہ اس وقت تک ہندوستان کے اور باشندوں میں پیدا نہ کی جا سکی تھی جب ہندوستان کے پانچ سو علماء کے دستخط سے یہ فتویٰ شایع ہوا کہ برطانوی حکومت کا تعاون اور موالاۃ حرام ہے، سرکاری خطابات و اعزازات قبول کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا، برطانوی حکومت کے خلاف جان و مال کی قربانی اسلام کی نشانی بتائی گئی، تو اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اس طرح آگے بڑھے کہ علی برادران کو اس وقت مسلمانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ گاندھی جی یا کسی اور ہندو لیڈر کو ہندوؤں میں نہ تھی، گاندھی جی جلسوں میں کہا کرتے کہ مولانا شوکت علی کی لمبی چوڑی جیب میرا مسکن ہے، اسی زمانہ میں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی نے کراچی میں خلافت کانفرنس کی صدارت کی تو اس میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ قرآنی آیات اور احادیث سے برطانوی حکومت کی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے، چند روپیوں کی خاطر ہمیشہ کے لیے دوزخ میں اپنا گھر بنانا ہے، برطانوی حکومت نے اس کو فوج میں بغاوت پھیلانے کا مترادف قرار دیا، اور مولانا محمد علیؒ کو ان کے اور ساتھیوں کے ساتھ والٹیر میں گرفتار کر لیا، کراچی میں ان پر فوج میں بغاوت کرانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا، انھوں نے اس مقدمہ میں جس جرأت، بے باکی، مردانگی، وطنی محبت، مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت و حرارت کے ساتھ انگریز جج کا مقابلہ کیا وہ جنگ آزادی کی تاریخ کی بڑی زریں سرخیاں ہیں، انگریز حاکم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو دو دو سال کی سزا دی، اس سزا سے وہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں

اور بھی مقبول ہوئے، انکے جیل جانے کے بعد ان کی بوڑھی ماں بی اماں اور بیوی آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے بڑھیں، پورے ہندوستان کا دورہ کیا، جس سے تحریک بڑی جاندار رہی۔

وہ جیل سے چھوٹے تو ان کو ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے سالانہ جلسہ کا صدر کوکناڈا میں بنایا، اس میں انھوں نے جو خطبہ دیا وہ آج بھی پڑھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی عظیم ترین محب وطن کے جذبات سے کم نہیں، اس میں گاندھی جی کو اپنا سردار' سردار اعظم کہا، اور اپنے زمانہ کا سب سے بڑا مسیح نما شخص اور شاہ امن قرار دیا، اور یہ بھی لکھا کہ جو نسخہ انھوں نے ہندوستان کے امراض کے لیے منتخب کیا وہ وہی تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے یہودیت کے لیے منتخب کیا، اس سے ظاہر ہوگا کہ ان کے دل میں گاندھی جی کی کتنی محبت اور وقعت تھی، وہ تو ایک موقع پر یہاں تک کہہ گئے کہ وہ تو گاندھی جی کو اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل احترام اور اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بڑھ کر قابل احترام سمجھتے ہیں، ایک موقع پر یہ بھی کہا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد گاندھی جی ہی کے حکم کو ماننا پسند کرتا ہوں، ان پر یہ الزام آیا کہ انھوں نے ہندوؤں کی غلامی قبول کر لی اور گاندھی پرست ہوگئے ہیں، مگر خود مولانا محمد علیؒ کو فخر تھا کہ کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا، اس سے پہلے خوش وضع عافیت پسندوں کی تفریح گاہ تھی، اور اپنے اخبار ہمدرد کی ایک تحریر میں لکھا کہ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رہے کہ مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتے رہے، حتیٰ کہ کانگریس کے لیے ایک کروڑ روپیے جمع کرنے کے دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کیے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی، (ہمدرد، ۲۵ ستمبر ۱۹۲۶ء)

مگر ان کی زندگی کا یہ سانحہ بھی رہا کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وہ کانگریس سے دور ہوگئے، یا کانگریس ان سے دور ہوگئی، اس کے اسباب کے تجزیہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن اس سے علحدگی کے باوجود جب سائمن کمیشن کا تقرر ہوا، تو اس سلسلہ میں انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہوئے، انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں یہ پیام دیا کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سائمن کمیشن کی آمد کو ناکام بنادیا تو ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زریں حروف سے لکھا جائے گا۔

اس وقت تک ہندو مسلم کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے، مسجد کے سامنے باجہ، مخلوط یا جداگانہ انتخاب، پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، ہندوؤں کی نمایندگی کتنی ہو، سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دیے جائیں کہ نہیں؟ بمبئی سے سندھ علحدہ کیا جائے کہ نہیں؟ مرکز میں مسلمانوں کی نمایندگی کتنی ہو، اور ان صوبوں میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہو وہاں کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہو وغیرہ وغیرہ، ان تمام معاملات میں مولانا محمد علی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے رہے، لیکن ان اختلافات کے ساتھ وہ آزادی کے لیے بھی بے قرار رہے، ایک ایسا موقع بھی آیا کہ ہندو آزادی سے مایوس ہوئے تو نہرو رپورٹ کے ذریعہ سے درجۂ مستعمرات کے طالب ہوئے، لیکن مولانا محمد علیؒ نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ جو لوگ آزادی کے مخالف اور درجۂ مستعمرات کے حامی ہیں' وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں بلکہ بزدل ہیں، جس جلسہ میں یہ تقریر کی وہاں ان کے خلاف بڑا ہنگامہ ہوا، اور ان پر نفریں کی بوچھار برسائی گئی، اور پھر جب ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو وہاں اپنی معرکۃ الآرا تقریر میں بہ بانگ دہل کہا کہ:

> "میں جس مقصد سے یہاں آیا ہوں' وہ یہ ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاسکتا ہوں جب کہ میرے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہوگا، ورنہ میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا، میں ایک غیر ملک میں جو اگر آزاد ہے' مرنے کو ترجیح دوں گا، اور اگر آپ نے ہندوستان کو آزادی نہیں دی تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔"

اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کیا وطن دوست اور ہندوستانی ہوسکتا ہے، وہ وطن دوست اور حریت پرور ہندوستانی بن کر حق دوست اور خدا پرست مسلمان بن کر رہنا چاہتے تھے، اور اسی طرح زندگی گذاری، جہاں وطن کی آزادی کی خاطر سر بکف رہے' وہاں طرابلس کے لیے سوگوار، عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار، انگورہ کے لیے مرثیہ خوان اور حجاز کے لیے سوختہ غم رہے، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر تو ہندوستان کے

چپہ چپہ پر سیاسی جنگ کی، اور انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اچھا مسلمان ہی اچھا ہندوستانی ہو سکتا ہے،
گول میز کانفرنس کی تقریر میں ان کا یہ کہنا بہت ہی معنی خیز ہے :

"جو لوگ سیاست سے مذہب کو الگ کرتے ہیں، وہ مذہب کا غلط تصور رکھتے ہیں، مذہب عقیدہ یا رسول تک محدود نہیں، مذہب میرے خیال میں زندگی کی ایک تعبیر ہے، میں ایک کلچر رکھتا ہوں، اصول سیاست اور زندگی کا ایک مطمح نظر رکھتا ہوں، اور ان ہی چیزوں کے مکمل امتزاج کا نام اسلام ہے، جہاں تک خدا کے احکام کا تعلق ہے میں اول مسلمان ہوں، بعد میں مسلمان ہوں، آخر میں مسلمان ہوں، اور کچھ بھی نہیں صرف مسلمان ہوں، اگر آپ اپنے امپائر میں اور اپنی قومیت میں مجھ کو اس مکمل آمیزش، اس اصول سیاست، اس کلچر اور اس اخلاق کو چھوڑ کر داخل ہونے کو کہیں تو میں داخل ہونا پسند نہ کروں گا، میرا پہلا فرض میرے خالق کے لیے ہے، بادشاہ سلامت کے لیے نہیں ہے، اور نہ اپنے ساتھی ڈاکٹر مونجے کے لیے ہے، میرا پہلا فرض میرے پیدا کرنے والے کے لیے ہے، اور یہی حال ڈاکٹر مونجے کا بھی ہے، ان کو پہلے ہندو ہونا چاہیے، جیسا کہ میں اپنے اس فرض کو بجا لانے کے لیے پہلے مسلمان ہوں، لیکن جہاں ہندوستان کا مسئلہ آتا ہے، جب اس کی آزادی کا سوال آتا ہے، جب اس کی فلاح و بہبود کی بحث آئے گی تو میں پہلے ہندوستانی ہوں، بعد میں ہندوستانی ہوں، آخر میں ہندوستانی ہوں اور کچھ بھی نہیں، صرف ہندوستانی ہوں، میرے دو دائرے ہیں، جو برابر ہیں، ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں،

یہ محض زور خطابت میں نہیں کہا گیا، بلکہ زندگی بھر کے تجربے کے بعد ایک سچے، مخلص اور دیانتدار مسلمان ہندوستانی یا ہندوستانی مسلمان رہنما نے کہا ہے، یہ ہندوستان کے ہندو مسلمان دونوں کے لیے ایک پولیٹکل فلسفہ بن سکتا ہے، ہندو اس کو اپنا پولیٹیکل فلسفہ بنانا پسند نہ کریں، لیکن ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کے لیے یہی پولیٹکل فلسفہ ان کے وجود کا ضامن بن سکتا ہے، کچھ لوگ اس کو فرقہ واریت کا رنگ دے کر رد کرنے کی کوشش کریں گے، مگر خوشی کی بات ہے کہ ہمارے مسلمان سیکولرسٹ اور وطن دوست بھی

اسی آئیڈیل کو پسند کرنے لگے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑھ کر کون وطن دوست اور سچا ہندوستانی ہو سکتا ہے، انھوں نے بھی اسی رنگ میں سوچنے کی کوشش کی ہے، ان کے یہ خیالات تھے :

"میں ایک مسلمان ہوں، اور اس خیال سے مجھ کو فخر محسوس ہوتا ہے کہ گذشتہ تیرہ سو برس کی جو اسلامی روایات ہیں وہ میری وراثت ہے، میں اس کو بال برابر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیم، اسلامی آرٹ، اسلامی سائنس اور اسلامی کلچر میری دولت کے اجزا ہیں، اور ایک مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ فرض ہے کہ میں ان کو محفوظ رکھوں، ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تہذیبی اور مذہبی حلقوں میں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہوں، اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ میرے اس روحانی ورثہ میں کوئی مداخلت کرے، ان جذبات کے ساتھ میں ایک اور چیز کا بھی مالک ہوں جو میری خارجی زندگی کے حقائق ہیں، اسلام کی روح میرے اس دوسرے عقیدہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتی، اسلام مجھ کو اس کی طرف مائل کرتا ہے، مجھ کو فخر ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، میں یہاں کی متحدہ قوم کا ضروری جز ہوں اس قوم کی شوکت میرے جیسے قیمتی جز کے بغیر نامکمل ہے، میں اس قوم کی تشکیل کا بہت ضروری حصہ ہوں، میں اپنے اس دعوی کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں، ہم اپنے ساتھ یہاں بہت بڑا خزانہ لائے، یہ سرزمین خود بھی بڑی دولت سے مالامال تھی، ہم نے اپنی دولت اس ملک کو دی، اور ہندوستان نے اپنے خزانہ کا دروازہ ہمارے لیے کھول دیا، ہم نے اس ملک کو اپنے ورثہ کی بہت سی قیمتی چیزیں دیں، جن کی ضرورت اس کو تھی، ہم نے اس کو جمہوریت اور مساوات کا پیام دیا"

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے یہ سب جو کچھ کہا، وہ ان ہی جذبات کی ترجمانی ہے جس کا اظہار مولانا محمد علیؒ نے گول میز کانفرنس کی تقریر میں کیا تھا، گو اس کے کہنے میں ابوالکلامیت ہے، پھر اسی بات کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہت ہی واضح طور پر اپنے رنگ میں کہا ہے، وہ ایک اچھے مسلمان تھے اور ان کے بہت اچھے ہندوستانی ہونے میں کسی کو شک نہیں ہوا، اسی لیے حکومت نے ان کو بہار کا گورنر، پھر جمہوریۂ ہند کا نائب صدر

اور صدر بنایا، انھوں نے کاشی ودیاپیٹھ بنارس میں اپنا خطبہ دیتے ہوئے بڑی دور بینی اور دل سوزی سے فرمایا:

"کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا کہ نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے، ممکن ہے کہ بعض نیک نیت اور انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو، مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کر لیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے، آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں اس مجمع کے سامنے صفائی سے یہ بات پیش کر دوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور اس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں، سچے ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان یہ قیمت ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی' ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے، بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں، بلکہ

ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں، ہندوستانی مسلمان کو اپنا دیش کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں، مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارا نہ کریں گے، جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو۔" (منقول از یادوں کی دنیا، از ڈاکٹر یوسف حسین ص ۲۱۲۔۲۱۳)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اوپر جو کچھ کہا ہے اس میں اور مولانا محمد علیؒ کے فرمودات میں کوئی فرق نہیں۔

ذرا اسی بات کو اور دوسرے انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں، یہاں پر اس کی وضاحت کرنے میں پروفیسر ہمایوں کبیر کی کچھ تحریروں کا سہارا لیں گے، ان سے بڑھ کر کوئی سیکولرسٹ نہیں ہو سکتا، انھوں نے ہندو مسلم کے میل ملاپ کا تاریخی تجزیہ بڑی غیر جانبداری سے کیا ہے، انھوں نے ایک بہت ہی پر مغز مضمون ہندوستانی مسلمان کے عنوان سے ایک انٹرنیشنل کمیشن کے لیے لکھا، جو پیرس کے جرنل آف ورلڈ ہسٹری میں شایع ہوا، پھر کلکتہ کے رسالہ انڈو ایرانیکا (ستمبر ۱۹۵۵ء) میں لکھا، اس میں انھوں نے اس کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"ہندوستان کی قومی اقتصادیات میں مسلمان اس کے اہم ترین اجزا میں سے ہیں، وہ کم سے کم ایک ہزار برس تک، خاص طور پر شمالی ہند میں بڑی قوت بن کر ہندوستان کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ کی تعمیر میں لگے رہے،..... وہ ہندوستانی زندگی میں ضرور گھل مل گئے، لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو باقی رکھا، انھوں نے ہندوستانی زندگی کو بہت کچھ دیا، اپنی اُن خصوصیات کو باقی رکھا جن سے وہ صاف طور پر پہچانے جا سکتے ہیں، وہ ہندوستانی زندگی کے جز بن کر رہے، لیکن اسی کے ساتھ اپنی واضح حیثیت بھی برقرار رکھی، اور یہ بات ایسی ہے کہ جس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملے گی۔"

مگر اس کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو مورخانہ تجزیہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور یہ بڑی اہم حقیقت ہے، جس کو کوئی انکار نہیں کر سکتا، وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان نے ان تمام بیرونی قوموں کو جو مختلف اوقات میں اپنے ساتھ بیرونی تہذیب بھی لائے، اپنے

معاشرتی اور مذہبی ڈھانچے سے مدغم کرتے رہے، مسلمان دوسرے ملکوں میں گئے تو ان کو اپنی اسلامی ثقافت سے اپنے میں جذب کر لیا، لیکن ہندوستان ہی ایسا مستثنیٰ ملک ہے جہاں اسلام کو ہندوستان اپنے میں ضم نہ کر سکا، اور نہ اسلام ہندوستان کو اپنے میں مدغم کر سکا۔"

پروفیسر ہمایوں کبیر نے اسی مضمون میں بحث کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر میں fusion ضرور ہوتا رہا، لیکن Absorption نہیں ہوا، یعنی ہندوستان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے قریب ہونے اور رہنے کی کوشش کریں، ایک دوسرے کو اپنے میں ضم اور مدغم کرنے کی فکر نہ کریں، یہ بھی گویا مولانا محمد علی کے سیاسی جذبات کی آواز بازگشت ہے، وہ جب کوکناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے تھے تو اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

"یہ بات مسلم اور یقینی ہے کہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے، اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس موقع کو اس وقت کھو دیا جب کہ محمد بن قاسمؒ نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا، اس وقت تو مسلمان قلیل تعداد میں تھے، اور اب تو ان کی تعداد سات کروڑ سے بھی زیادہ ہے، اور اگر مسلمانوں کو اس قسم کا خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا موقع ہاتھ سے کھو دیا، جب کہ وہ کشمیر سے راس کماری اور کراچی سے چاٹگام تک حکمراں تھے، اس وقت اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں کی نسل کو فنا کر سکتے تھے، فارسی کی کیا خوب مثل ہے:

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خویش بزن

جب کوئی چارۂ کار نہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چھٹکارا پا سکیں تو ان کو ایسی صورت نکالنی چاہیے کہ ایک دوسرے کی معاونت تسلیم کی جائے۔"

اسی معاونت میں ہندوستان کی اکثریت اور اقلیت کے تعلقات کی پولیٹکل فلاسفی بنائی جا سکتی تھی مگر افسوس کہ گذشتہ برسوں میں اس کی نشو و نما نہ ہو سکی، جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں اب بھی ہولناک اور

دردناک واقعات پیش آتے رہے، اس کی تفصیل لکھنے میں قلم لرزتا ہے۔

اس نئے ہندوستان میں انتہا پسند قوم پرور اور قوم پرست جو بھی سوچیں، خود مسلمانوں کو سوچنا ہے کہ ان کا کیا رول ہو، آج کل کے دبے مسلمانوں کے دبے ہوئے جذبات تو وہی ہیں جو مولانا محمد علیؒ نے گول میز کانفرنس کی تقریر میں کہا تھا، اور جس کی وضاحت مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر ہمایوں کبیر نے کی ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمانوں کی اصلی خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے ملی وجود اور تمدنی ہستی کو برقرار رکھ کر سچے اور اچھے ہندوستانی بنے رہیں، مولانا محمد علیؒ نے جب جامعہ ملیہ قائم کیا تھا تو انھوں نے اعلان کیا تھا کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے، اور اسی کے ساتھ ان کو وطن دوست و حریت پرور بنایا جائے۔

ہم اگر موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکتے ہیں تو برملا یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت کے مسلمان یہی چاہتے ہیں کہ وہ خدا پرست مسلمان بن کر وطن دوست ہندوستانی بنے رہیں، کیا ایسا ہونا ممکن نہیں؟ ممکن ہے خود مولانا محمد علی اس کی تعلیم یہ لکھ کر دے گئے ہیں:

"ایک مسلمان قوم پرور اور محب وطن اس لیے ہے کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جار کو تسلیم کیا ہے، اور جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی ترجیح دی، وہ قومیت مشترکہ کے خلاف نہیں ہو سکتا، ہر حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی اسلام اور ایمان کے منافی ہے، حقیقۃً ایک مسلمان کے لیے حب الوطن من الایمان ہے۔"

مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ:

"ایک فریبی، ریاکار، مفاد پرست اور بدکردار سیاست دان ملک کے لیے مفید نہیں ہو سکتا، چاہے وہ اپنے کو خالص ہندوستانی ہونے کا ڈھنڈورا کیوں نہ پیٹتا رہے، جو شخص اپنے نفس کی

حفاظت اور تربیت سے غافل ہے وہ اپنے خاندان کو کیا نفع پہونچا سکتا ہے، جو اپنے خاندان والوں کے سود و بہبود سے غافل ہے، وہ ملت کے سود و بہبود کے لیے کیا کر سکے گا، اور جو ملت کیلئے کچھ نہیں کر سکتا ہے وہ بھلا قوم اور ملک کے لیے کیا کر سکے گا۔"

مولانا محمد علی کی تعلیمات کی روشنی میں اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اسی میں ہے کہ خدا پرست اور حق دوست بن کر وطن دوست بنیں، اور اسی میں ملک کی بھی فلاح و بہبود ہے، انتہا پسند قوم پرور اور قوم پرست کا جو بھی نعرہ ہو، لیکن مسلمانوں کو اپنا یہی لائحہ عمل بنانا ہے، اور جو لوگ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے کھلا ذہن رکھتے ہیں وہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچیں گے کہ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو اقصابی جنگ، ذہنی ارتداد، اور بلوے فساد کے ذریعہ سے رام کیا جا سکتا ہے، یا ان کے صحیح جذبات کا صحیح اماله کر کے ان کے دلوں کی تسخیر کی جا سکتی ہے، مسلمانوں کے ارباب حل و عقد کو بھی یہ سوچنا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی شعور کے تحت الشعور میں جو جذبات دبے پڑے ہوئے ہیں ان کو صحیح معنوں میں کیسے ابھار کر ملک کے قومی بہاؤ میں ان کو سیل رواں بنایا جا سکتا ہے، مسلمان عوام اپنی تمام مصیبتوں اور بے چارگیوں کے باوجود ابھی تک اپنے ظرف میں سونے کی طرح کھرے ہیں، وہ کھوٹے نہیں ہوئے ہیں، ان کا ظرف اس وقت زنگ آلود ضرور ہو گیا ہے، اس کو کھرچنے کی ضرورت ہے، پھر وہ کندن کی طرح چمکتے نظر آئیں گے، اگر ان کے دبے ہوئے صحیح جذبات کو صحیح طور پر ابھارنے کے بجائے کسی اور رخ پر موڑنے کی کوشش کی گئی تو ان کا سواد اعظم منجمد اور جامد ہی بن کر سیاسی زندگی بسر کرنے پر مائل ہو جائے گا، اور شاید وہ اپنی بے بسی اور لاچارگی میں انتظار کرے کہ ان کے لیے کوئی محمد علی پیدا ہو جائے، اور اپنی بانگ درا سے ان کو پھر جگائے، اس وقت تک مولانا محمد علیؒ ہی کا یہ شعر پڑھ کر ساکت و صامت ہو کر منتظر فردا ہی رہیں گے۔ ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

مکتوب

مولانا سید احمد عروج قادری مدیر ماہنامہ "زندگی"

مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

بغیر کسی مصنوعی تواضع کے، دلی جذبات سے عرض کرتا ہوں کہ میں ایک قلیل العلم، کثیر الخطا آدمی ہوں، میری تحریروں میں نہ صنائع و بدائع ہوتے، نہ تشبیہات و تمثیلات ہوتی ہیں، اور نہ کوئی حسن و جمال ہوتا ہے جو کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے سیدھی سادی زبان میں لکھ دیتا ہوں، یہ بات میں نے اس لیے لکھ دی ہے کہ آپ لوگوں کے مضامین کے لیے میری مدح کوئی حیثیت نہیں رکھتی، معارف کا تازہ شمارہ میں نے پڑھا، معارف میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے پڑھ رہا ہوں، طالب علم اب بھی ہوں، لیکن طالب علمی کا باضابطہ دور ختم ہو چکا ہے، میرا ایک دو مضمون بھی معارف میں شایع ہو چکا ہے، آپ نے سر سید احمد خان پر جو مضمون لکھا ہے اس کا بڑا فائدہ مجھے یہ پہونچا کہ ان کے بارے میں میری سوء ظنی بہت کم ہو گئی، قرآن کی تفسیر میں جو غلطیاں انھوں نے کی ہیں اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے، مخلص انسانوں سے بھی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں، محترم صباح الدین صاحب کا طویل مقالہ بھی پڑھا، انھوں نے شاگردی کا حق ادا کیا ہے، میں نے سید صاحب سے کوئی سبق تو نہیں پڑھا، مگر میں ہمیشہ ان کو اپنا معنوی استاد سمجھتا رہا ہوں، اور اب بھی سمجھتا ہوں، میرے لیے یہ فخر کی ایک بات ہے کہ حیات سلیمان میں محترم معین الدین ندوی مرحوم و مغفور نے صرف میری نظم شامل کی ہے، صباح الدین عبد الرحمن صاحب کی تصویر تو میں نے اخبارات میں دیکھی ہے، مگر اب تک ان کو نہیں دیکھا، ان کو اور دیگر اہل علم کو سلام پہونچا دیجیے، خصوصیت کے ساتھ مولانا ضیاء الدین صاحب کو میرا سلام کہیے،

۱۳ر مارچ ۸۵ء۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اوقاف : مرتبہ جناب اشفاق علی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۳۰۲، مجلد مع گردپوش، قیمت تیس روپیے، پتہ : جناب اشفاق علی ۱۳۳/۴۴ نظیر آباد، لکھنؤ۔

وقف یعنی کار خیر اور رفاہ عام کے لیے اپنی کوئی چیز مخصوص کر دینا اسلام کے مخصوصات میں ہے، جس کا اس نے بڑا اجر وثواب بتایا ہے، فقہ کی کتابوں میں اس کے ضروری مسائل درج ہیں، مگر اوقاف کی ابھی تک کوئی تاریخ اردو میں نہیں لکھی گئی تھی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اور کئی حصوں پر مشتمل ہے، پہلے اوقاف کی اہمیت اور فائدے بیان کیے ہیں، اور بتایا ہے کہ اس کی بدولت ماضی میں مختلف دینی، ملی اور قومی کام انجام پاتے رہے ہیں، اور ناداروں اور محتاجوں کی اس کے ذریعہ اعانت بھی کی جاتی رہی ہے، پہلے انھوں نے وقف کا مفہوم واضح کرنے کے بعد صدقہ اور انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت میں وارد قرآنی آیات واحادیث نقل کرکے ان کا ترجمہ اور مختصر تشریح کی ہے، پھر عہد بہ عہد اوقاف کی تاریخ بیان کی ہے، پہلے دور رسالت اور صحابۂ کرام کے زمانہ کے اوقاف کا حال لکھا ہے، پھر اموی، عباسی اور ترک خلفاء کے زمانہ کے اوقاف کا تذکرہ ہے، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور ہندوستان کے بادشاہوں میں فیروز شاہ تغلق، شیر شاہ سوری، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے اوقاف کے بارہ میں بھی معلومات تحریر کیے ہیں، ہندوستان کی بعض مسلم ریاستوں بھوپال اور رامپور کے علاوہ کشمیر کے بعض اوقاف کا ذکر بھی ہے، دنیائے اسلام کے درج ذیل آٹھ اہم اوقاف کا ایک مستقل عنوان کے تحت ذکر ہے، وقف کعبہ شریف، وقف مسجد نبوی، وقف قبرستان جنۃ البقیع، وقف جامع ازہر (مصر) وقف جامع دمشق (شام) وقف جامع قرطبہ (اندلس) وقف مدرسہ صولتیہ

(سعودی عرب) وقف تاج محل (آگرہ) آخر میں اوقاف آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) اور وقف صابو صدیق مسافر خانہ بمبئی کا تذکرہ بھی ہے، اس سلسلہ میں نظام بیت المال اور ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت میں اوقاف کے نظام کی نوعیت وکیفیت بھی بیان کی ہے، اور چند مغل فرماں رواؤں کے فرامین واسناد کے نمونے بھی دیے ہیں، لائق مصنف نے جن اوقاف کا تذکرہ کیا ہے ان کی مختصر تاریخ اس طرح لکھی ہے کہ اس سے ان کی نوعیت وکیفیت اور مقاصد وشرائط کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے، جن صحابۂ کرام کے اوقاف کا تذکرہ ہے ان کا سراپا بھی بیان کیا ہے، اور بعض اوقاف کی عمارتوں کے عکسی فوٹو بھی دیے ہیں، یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے، جس کے لائق مرتب تحسین کے مستحق ہیں، وہ یوپی سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کے سکریٹری ہیں، اس لیے اوقاف کے عملی پہلوؤں پر بھی ان کی نظر ہے، انکو اپنے تجربہ اور واقفیت کی بنا پر اوقاف کے نظام کی اصلاح اور اسے دین، ملت اور قوم کے لیے زیادہ بہتر اور مفید بنانے کے مسئلہ پر بھی توجہ دینی چاہیے، جن کی حالت آزادی کے بعد بہت ابتر ہو گئی ہے،

تورییت اور یہود اپنے آئینے میں : مرتبہ مولوی عبد الحفیظ رحمانی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۱۲، قیمت ۱۲ روپیے، پتہ : مرکز دعوت اسلام جمعیۃ علمائے ہند، دیوبند یوپی۔

اس میں توراۃ کی نوعیت اور یہود کی مکروہ اور گھناونی تصویر خود تورات اور علمائے یہود کی کتابوں سے دکھائی گئی ہے، مقدمہ میں قرآن مجید میں کثرت سے یہود کا تذکرہ کیے جانے اور نبوت محمدی کی تکذیب کی وجہیں بیان کی گئی ہیں، اس سلسلہ میں اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں، آیات الٰہی میں تغییر وتحریف، احکام الٰہی سے سرتابی اور بدکرداری کا اجمالی ذکر بھی آگیا ہے، یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں توراۃ کے غیر معتبر اور محرف ہونے پر بحث کی ہے، پہلے بائبل کے دونوں حصوں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید میں شامل کتابوں کی فہرست دی ہے، پھر تورات کے نزول، اس کی گم شدگی اور بازیابی، اس کے جلائے جانے، حضرت عزیر کے اسے از سر نو مرتب کرنے، اور اس کے ضایع ومحرف ہو جانے کی داستان

سنائی ہے، اور توراۃ کی موجودہ کتابوں کے بارہ میں لکھا ہے کہ نہ ان کے مصنفین کا پتہ چلتا ہے اور نہ زمانۂ تصنیف کا، تورات کے غیر معتبر اور محرف ہونے کے ثبوت میں یہ بھی دکھایا ہے کہ اس کے مضامین میں باہمی اختلاف و تناقض ہے، اور اس کی عبارتیں سوقیانہ، فحش اور جذبات کو برانگیختہ کرنے والی ہیں، اس میں خدا کو ان صفتوں سے متصف بتایا گیا ہے جو مخلوق کی صفتیں ہیں، نیز اس میں جن کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں یا جن کا ذکر ہے، وہ سرے سے موجود نہیں ہیں، دوسرے حصہ میں پہلے یہود کی وجہ تسمیہ، سکونت اور مختصر سرگذشت بیان کی ہے، اس کے بعد توراۃ سے ان کی سرکشی، معصیت، نافرمانی، بت پرستی اور اسکی تبلیغ، انبیاء و صلحاء کی شان میں گستاخی، بہتان تراشی، ایذا رسانی، ان کا قتل، نیز زنا، لواطت، شراب نوشی، باہمی خوں ریزی، اور ان جرائم کی پاداش میں سزا پانے وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے، آخر میں ۱۹۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کے قیام اور عربوں اور ان کے مابین جنگ کا ذکر کیا ہے، اور اس توقع پر کتاب ختم کی ہے کہ "اللہ کی نظر میں مغضوب قوم پھر شکست و ہزیمت، ذلت و رسوائی سے دوچار ہوگی اور مسلمان مظفر و منصور ہوں گے، ان شاء اللہ" مصنف نے کہیں کہیں توراۃ کی ان غلطیوں کی تصحیح بھی کی ہے جو اسلامی تصورات اور قرآن مجید کے بیان کے خلاف ہیں، یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی مفید ہے کہ اس میں توراۃ اور یہود کی تصویر کشی خود تورات اور علمائے یہود کی شہادتوں کی روشنی میں کی گئی ہے، لیکن کتاب مختصر ہے، موضوع کی اہمیت مزید تحقیق و تفصیل کی متقاضی تھی۔

اعقاب شاہ بدیع الزمان:۔ مرتبہ جناب سید مظفر حسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۲۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰ روپیے،

پتہ:۔ ۵۔ تر لوک ناتھ روڈ، لال باغ، لکھنؤ۔

جناب سید مظفر حسن صاحب ہمارے صوبہ کے مشہور اور سرگرم کارکن تھے، وہ برسوں اتر پردیش کی حکومت کے وزیر بھی رہے، مگر اب سیاسی سرگرمیوں اور جھمیلوں سے الگ ہو کر تصنیف و تالیف کے

شغل میں لگ گئے ہیں، اس سے پہلے ان کی کتاب "سیاسی سرگذشت" کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، اب انھوں نے زیر نظر کتاب میں الہ آباد کے دائرۂ شاہ رفیع الزمان سے وابستہ افراد کا ذکر کیا ہے، اور ان کی قرابتوں کی تفصیل تحریر کی ہے، اور اس کا نام "اعقاب شاہ بدیع الزمان" اس لیے رکھا ہے کہ سب متعلقین کے جد اعلیٰ وہی ہیں، یہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کی ابتدا سید عالم حضرت شاہ عبد اللطیف سے کی ہے، جن کے ذریعہ دائرہ کی بنیاد پڑی، اس میں ان کے اور ان کے رفقاء کے علاوہ دارا گنج، سید سراواں، چٹی نزور (نزول) کڑا، مانک پور اور موجودہ الہ آباد اور فتح پور کی مختلف تحصیلوں میں آباد سادات کے خانوادوں کے افراد اور ان کے باہمی رشتوں اور قرابتوں کا حال بیان کیا ہے، اور مسلمان بادشاہوں اور اودھ کے حکمرانوں کے زمانہ میں انھیں جو جاگیریں اور معافیاں ملی تھیں، ان کا بھی تذکرہ کیا ہے، دوسرے حصہ میں شاہ بدیع الزمان کے پوتے شاہ محمد زمان کے اعقاب اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کا حال درج ہے، پہلے حصہ میں جن افراد کا تذکرہ ہے، ان کے عام حالات بہت کم درج ہیں، مگر دوسرے حصہ میں بعض بعض اشخاص کے کسی قدر حالات بھی دیئے ہیں، دونوں حصوں میں اشخاص کا ذکر باہم ایسا خلط ملط ہو گیا ہے کہ جب تک اس خانوادہ سے متعلق دوسری کتابیں بھی پیش نظر نہ ہوں اس کتاب کے سمجھنے میں سخت دشواری ہوتی ہے، اگر مصنف نے ابتدا میں خانوادہ کا مکمل شجرہ درج کر دیا ہوتا تو قارئین کو کسی قدر سہولت ہو جاتی، تصنیف و تالیف ان کا خاص مشغلہ نہیں، اس لیے یہ کتاب علمی حیثیت سے چاہے معیاری نہ ہو، تاہم اس میں اس خانوادہ اور اس کے افراد کے متعلق مفید باتیں دی گئی ہیں بعض جگہ حوالے درج نہیں ہیں، اور بعض جگہ کتابوں کی جلدوں اور صفحات کی تعیین کے بغیر ہی حوالے دیئے گئے ہیں ایک جگہ لکھا ہے "مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی اپنے دونوں صاحبزادوں، قاری محمد طیب اور محمد طاہر کے ساتھ تھے، ۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۳۳۷) یہ دونوں حضرات تو مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے صاحبزادے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پوتے تھے، ایک جگہ تحریر ہے کہ "معاصر صدیقی (نواب صدیق حسن خان) (ص ۱۸۱) صحیح مآثر صدیقی ہے، اس کتاب میں نواب صاحب کے فرزند صفی الدولہ حسام الملک نواب

علی حسن خان نے اپنے والد کے حالات تحریر کیے ہیں، مگر مصنف نے اس کو اس طرح لکھا ہے کہ وہ اسے خود نواب صدیق حسن صاحب ہی کی تصنیف خیال کرتے ہیں، ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "شاہ محمد سلیم بنارس میں مطب کرتے تھے، اور انھیں دست شفقت حاصل تھا (ص ۲۰۴) غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے، صحیح دست شفا ہوگا، کتابت کی اور غلطیاں بھی ہیں، مثلاً پُراثمرادات (ص ۲۵۲) بجائے پراسرارات، علاوہ ازیں اسرار تو خود ہی جمع ہے، اس کی جمع الجمع بلا ضرورت ہے، استسقار (ص ۳۲۵) بجائے استفسار وغیرہ۔

دید و دریافت :۔ مرتبہ جناب شمس بدایونی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۳۲، قیمت بارہ روپے، پتہ :۔ روشن پبلیکیشنز، روشن محل، سادتھ بدایون۔

یہ جناب شمس بدایونی، ایڈیٹر روشن بدایون کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے، اور مختلف رسالوں میں چھپے تھے، اس میں بدایون سے تعلق رکھنے والی ادبی شخصیتوں کے حالات وکمالات تحریر کیے گئے ہیں، اور زیادہ تر ان اشخاص کو زیر بحث لایا گیا ہے جو صاحب کمال ہونے کے باوجود گمنام رہے، مثلاً تولا بدایونی، علی حاتم بدایونی، فوق سبزواری، قمرالدین احمد قمر، وحید احمد، ثنا لودی، خالد بدایونی، بدایوں کے دو ہندو ادیبوں پر بھی مضامین ہیں، ایک جناب دیبی پرشاد سحر اور دوسرے جناب دیبندید پرشاد سکینہ، مشہور وممتاز لوگوں میں فانی، بیخود، شکیل اور دلاور فگار کا تذکرہ بھی ہے، جن لوگوں پر اس مجموعہ میں مضامین درج ہیں ان میں دو تین کے علاوہ سب وفات پا چکے ہیں، بدایون مدت سے علم وادب کا مرکز رہا ہے، مصنف نے ابتدا میں اس کی تاریخی وعلمی حیثیت بھی بتائی ہے، ایک مضمون "غالب بدایون میں" ہے، اس میں پہلے بدایون کی غالب شکنی پر گفتگو کی ہے، اور اس کی وجہ یہاں کی شعری فضا پر ذوق دہلوی کے تلامذہ کا اثر بتایا ہے، اس سلسلہ میں غالب کے خلاف لکھی جانے والی کتابوں اور تحریروں کے نام گنائے ہیں، پھر غالب شناسی کا ذکر کرتے ہوئے بدایون سے ان کے دیوان کے مختلف ایڈیشنوں اور ان کی بعض کتابوں کی اشاعت، اور وہاں کے بعض اہل قلم کے غالب پر مضامین اور کتابوں کی فہرست دی ہے اور

غالب کے بعض بدایونی تلامذہ کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن اشخاص پر مضامین لکھے گئے ہیں ان کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں اور ان کی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، اور ان کی شاعری اور نثر نگاری پر اظہار خیال بھی کیا ہے، یہ سب مضامین زیادہ بلند پایہ تو نہیں ہیں، تاہم ان سے مختلف دلچسپ باتیں اور بعض گمنام ادیبوں کے بارہ میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں لیکن مصنف کی تحریر میں بعض جگہ اعتدال قائم نہیں رہا ہے، اسی لیے انھوں نے بدایون کے مزاح نگار شاعر حاتم بدایونی کو اکبر اور اقبال جیسے شاعروں کا ہم پایہ قرار دے دیا ہے، بعض جگہ ان کی تحریر میں دوسروں پر خواہ مخواہ طنز وتعریض کی گئی ہے، ایک جگہ مولانا عبدالسلام ندوی مصنف شعرالہند پر سہل انگاری کا الزام عائد کیا ہے، (ص ۸۳) جس کو پڑھ کر غالب کی یہ نصیحت یاد آگئی کہ ع شکوہ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور، ان کو ہندی کا لفظ انیک بہت پسند ہے، جسے کئی جگہ لکھا ہے، بعض لفظوں میں املا کی غلطی بھی ہے، جیسے معرکۃ الارئی (ص ۱۱۴) اُبا بجائے اِبا، ایک جگہ فضا کو مذکر لکھا ہے (ص ۱۰۳) ایک جگہ لکھتے ہیں: "مگر ذوق خانہ رسائی ہر جگہ مانع آئی" (ص ۱۲۰) خانہ ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو، مگر مانع کو مانی لکھنا کیا سہل انگاری ہے؟

لائبریرین شپ :۔ مرتبہ جناب سید مقیت الحسن صاحب ایم۔ اے، ڈیپ لب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۱۲، مجلد، قیمت ۲۰ روپیے، پتہ :۔ عثمانیہ بکڈپو ۱۰۴، نور جیت پور روڈ، کلکتہ ۱۳

اس کتاب میں کتب خانے کے تنظیمی امور ومسائل کے بارہ میں مفید معلومات درج ہیں، پہلے کتب خانہ کی ضرورت اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی ہے، جس میں مختلف ملکوں کے علاوہ خاص طور پر ہندوستان کے کتب خانوں کا ذکر ہے، اس سے یہاں مختلف عہد میں کتب خانوں کے قیام ورواج کا پتہ چلتا ہے، لائق مصنف نے لائبریرین شپ (علم کتاب داری) کے اصول وضوابط تفصیل سے قلمبند کیے ہیں، کتاب کا یہی حصہ زیادہ اہم اور مفید ہے، اس میں کتابوں کے انتخاب اور آسانی سے ان کے حصول کے طریقے

بتائے گئے ہیں، اور ان کی درجہ بندی، فہرست سازی، کتب خانہ کی تنظیم، اس کے نظم و نسق، ببلیوگرافی یعنی صنعت کتاب سازی کی واقفیت، کتابوں کی حفاظت و نگہداشت ذخیرہ کے متعلق نہایت مفید اور ضروری باتیں بتائی ہیں، "لائبریرین شپ اور ضابطۂ اخلاق" کے زیرعنوان لائبریرین کو قارئین کی ضرورت و سہولت کا خیال کرنے اور ان کی خدمت کرنے اور انھیں فیض پہونچانے کی تاکید کی گئی ہے، ایک حصہ میں کتب خانہ کی مختلف قسموں کا ذکر ہے، پھر سات ممتاز ہندوستانی کتابداروں کے مختصر حالات و کمالات تحریر کیے ہیں، آخر میں انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل ان کے متبادل اردو الفاظ و اصطلاحات دیے ہیں، اردو میں اس موضوع پر پہلے بھی کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت اور فائدہ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے، اور اس میں لائق مصنف نے جدید معلومات سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا ہے، کتب خانوں کے ذمہ داروں اور ان سے وابستہ لوگوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا شمس الحق عظیم آبادی:۔ مرتبہ مولوی محمد عزیر صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت ۳۵ روپیے، پتہ :۔ علمی اکیڈمی، کراچی۔

مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادیؒ ہندوستان کے ممتاز علماء اور جمعیۃ اہل حدیث کے اساطین میں تھے، ہونہار مصنف نے ان کے علمی و تصنیفی کارناموں کو اپنی بحث و تحقیق کا خاص موضوع بنایا ہے، پہلے انھوں نے اس پر معارف میں ایک مضمون لکھا، پھر عربی میں ایک کتاب لکھی، جس پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا جا چکا ہے، اب اس کو حذف و اضافہ کے بعد اردو میں شایع کیا ہے، اس میں مولانا شمس الحقؒ کے خاندانی حالات، واقعات زندگی اور علمی کارناموں کے متعلق تلاش و تفحص سے معلومات جمع کیے ہیں، آخر میں مولانا کے آٹھ اردو اور ایک عربی خط کے علاوہ ان کے سلسلۂ اسانید کا خاکہ اور شجرۂ نسب بھی دیا ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی ہے، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور سے اب تک کے اہلحدیث علماء کی علمی سرگرمیوں اور کتب حدیث میں تصنیفات کا اجمالی جائزہ لیا ہے، مقدمہ خصوصیت سے مفید اور مصنف کی تلاش و جستجو اور علمی شوق و دلچسپی کا نتیجہ ہے، قیمت زیادہ ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۵ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۵ء عدد ۵

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ